تشنگی کا سفر

تشنگی کا سفر

طویل افسانوی نظمیں
تمثیلی غنائیہ
ایک کرداری منظوم تمثیل

حمایت علی شاعر

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے
غالبؔ

Himayat Ali Shair
C.B.45,Al-Falah Society
Shah Faisal Colony, Karachi-75230 Pakistan.
Ph: 92-21-4571322

تازہ ایڈیشن 2007ء
اہتمام اوجِ کمال
کمپوزنگ محمد شہزاد شفیق
قیمت 200 روپے

اپنی شریک حیات
معراج نسیم
کے نام

زیر اہتمام
ماہنامہ دنیائے ادب کراچی
6،623 فلور، ریگل ٹریڈ اسکوائر ریگل چوک، صدر۔ کراچی 74400
Ph: 92-21-8480816 / 0212018365
Cell: 0300-2797271 E-mail: dunyaeadab@yahoo.com

ترتیب

تشنگی کا سفر	حمایت علی شاعر
شعلۂ بے دود	(طویل افسانوی نظم)
بنگال سے کوریا تک	(طویل ترین افسانوی نظم)
بدلتے زاویے	(تمثیلی غنائیہ)
شکست کی آواز	(ایک کرداری منظوم تمثیل)

بونوں میں کیا کرے کوئی خوش قامتی پہ ناز
کیا جانے وہ ہنر کوئی، جو میرے فن میں ہے
حمایت علی شاعر

تشنگی کا سفر

'تشنگی کا سفر' میری طویل افسانوی اور تمثیلی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ نظمیں میں نے ۵۲ء سے ۶۳ء کے دوران لکھی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں ریڈیو پاکستان سے متعلق تھا اور بہ یک وقت کئی شعبوں میں کام کرتا تھا۔ صداکاری (اناؤنسر کمنٹریٹر، نیوز ریڈر اور ڈرامہ آرٹسٹ) مسودہ نگاری (نغمات، گیت، غنائیے، ڈرامے، فیچر اور تقاریر لکھنا) پروڈکشن (مختلف پروگراموں کی پیش کش وغیرہ) یہ ملازمت سالانہ کانٹریکٹ کی بنیاد پر ہوتی اور جن ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کو اس زمرے میں شامل کیا جاتا انہیں ریڈیو کی اصطلاح میں 'اسٹاف آرٹسٹ' کہا جاتا جن دنوں میں نے یہ ملازمت اختیار کی ان دنوں کراچی ریڈیو پر احمد فراز، سلیم احمد اور عبدالماجد سے لے کر چراغ حسن حسرت، بہزاد لکھنوی اور رفیع پیرزادہ تک سبھی اسٹاف آرٹسٹ ہوتے تھے میں چونکہ ہندوستان میں بھی نشریات کا تجربہ رکھتا تھا اس لیے مجھے فوری یہ ملازمت مل گئی مگر اسے میری طبیعت کی سیمابیت کہیے کہ نوجوانی کے باغیانہ جذبات ۔۔۔ میں افسرانِ بالا کی مستقل خوشنودی حاصل نہ کر پاتا اور کسی نہ کسی بہانے میری ملازمت ختم ہو جاتی۔ پھر عارضی طور پر میں کبھی انجمن ترقی اردو میں کام کرتا یا کسی اخبار میں ۔۔۔ اور پھر کسی کرم فرما کی توجہ سے مجھے دوبارہ ریڈیو کا کانٹریکٹ مل جاتا۔ میری زندگی میں یہ واقعات چونکہ نئے نہیں تھے اس لیے مجھے چنداں فکر بھی نہ ہوتی۔ شاید کچھ بزرگوں اور دوستوں کو یاد ہو کہ ۱۹۵۰ء میں آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے یکا یک ملازمت ختم ہو جانے اور کوئی ذریعہ معاش نہ ہونے کے سبب میں نے اخبار فروشی بھی کی تھی۔ مگر یہ

وہ دور تھا کہ ایک خاص ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے دور دراز رہنے والے ادیب بھی ایک دوسرے سے بہت قریب ہوتے تھے۔ چنانچہ میری زندگی کے اس معمولی واقعہ پر جب قمر ساحری اور وہاب حیدر نے احتجاج کیا تو نہ صرف دکن کے ادیبوں اور صحافیوں نے آواز اٹھائی بلکہ مرزا ادیب نے 'ادبِ لطیف' (لاہور) میں، فکر تونسوی اور نریش کمار شاد نے 'نقوش' (جالندھر) میں، ساحر لدھیانوی اور پرکاش پنڈت نے 'شاہراہ' (دہلی) میں اور عادل رشید، کیفی اعظمی اور خواجہ احمد عباس نے 'شاہد' 'نئی زندگی' 'بلٹز' اور 'کراس روڈس' (بمبئی) میں متواتر احتجاجی کالم لکھے۔ یہی نہیں بلکہ حیدرآباد دکن کے ایک صحافی اور میرے بچپن کے دوست ممتاز اختر نے تمام احتجاجی تحریروں کو جمع کر کے اپنے ہفتہ وار 'پرواز' کا ایک نمبر بھی شائع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں نہ صرف اپنے مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بڑھتا بلکہ دوسروں کے مسائل میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی آرزو بیدار رہتی۔

کراچی میں ہر چند ایسی فضا نہیں تھی مگر چند ہم خیال دوستوں کی رفاقت دل میں ایک امنگ ضرور پیدا کیے رہتی چنانچہ کراچی میں جب کبھی مجھ پر ایسی افتاد پڑی، میں حوصلہ مندی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتا رہا۔ یہاں میں نے زندگی اس عالم میں شروع کی تھی کہ جسم پر تن کے کپڑوں اور رہنے کیلئے ایک جھونپڑی کے سوا کچھ نہ تھا۔ کراچی کی لمبی لمبی سڑکوں پر اکثر پیدل گھومتا اور بھٹیار خانوں میں ایک یا دو وقت کھانا کھاتا۔ کبھی کبھی فاقے بھی کرنا پڑتے۔ اپنے کپڑے خود دھوتا اور اکثر بغیر استری کے پہن لیتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے عالم میں شہر کے سفید پوشوں کے درمیان میرا گزر ممکن نہ تھا۔ ریڈیو کے افسرانِ بالا بھی ایک نظر دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے۔ اس کا ردِعمل میری اس دور کی شاعری میں موجود ہے۔ دل میں باغیانہ جذبات سلگتے رہتے اور میں انہیں اپنے اشعار میں منتقل کر کے اپنی دانست میں یہ سمجھ لیتا کہ میں نے انقلاب کے لیے زمین ہموار کر لی۔ دراصل یہ نوجوانی کی رومانوی سوچ تھی جو مجھے خوش فہمی میں مبتلا کر کے مطمئن ہو جایا کرتی تھی۔

اس دور کی زندگی کا ایک واقعہ سناؤں جس نے میرے اندر ایک نئے احساس کو جنم دیا۔

میری بیوی شہر کے ایک اسکول میں ادیب فاضل کا امتحان دے رہی تھی اور میں اپنی بیٹی جاوداں اور بیٹے روشن خیال کو لیے صدر کی سڑکوں پر ان کا دل بہلا رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر کسی دوکان میں کوئی چیز دیکھ کر روشن خیال مچل گیا۔ میں دوکان دار سے بات کرنے لگا اور جاوداں میری انگلی چھوڑ کر کچھ آگے نکل گئی۔ جیسے ہی مجھے خیال آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ تھوڑے سے فاصلے پر سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک کار کو دیکھنے میں مصروف ہے۔ کار میں کچھ پیارے پیارے بچے بیٹھے ہوئے تھے اور جاوداں ہچکچائی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ میں قریب گیا تو وہ مجھے کہنے لگی

’ابو۔۔۔ یہ بڑے لوگ ہیں نا؟‘

جاوداں کا یہ فقرہ مجھے تیر کی طرح لگا۔ میں نے اسے احساس کمتری سے نکالنے کے لیے کہا۔ ’نہیں بیٹی۔۔۔ یہ بچے بھی تمہاری طرح ہیں۔ چلو، ان سے باتیں کرو‘

جیسے ہی میں جاوداں کو لے کر ان بچوں کی طرف بڑھا۔ بچے ڈر گئے اور جلدی سے کار کا شیشہ چڑھا لیا۔ شاید میری ہیئت ایسی ہو مگر مجھے اس کا احساس نہیں تھا۔ میں نے ان بچوں سے اپنی بیٹی کا تعارف کرانا چاہا۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے مجھے دیکھتے رہے اور ابھی میں ان سے مخاطب ہی تھا کہ بچوں کے والدین آ گئے اور صاحب نے تشویش اور حقارت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’کون ہے تو۔۔۔ یہاں کیا کر رہا ہے؟‘

مجھے غصہ آ گیا، مگر میں نے ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

’جناب۔۔۔ میری بچی آپ کے بچوں کو دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو رہی تھی۔ میں نے چاہا کہ ان کا آپس میں تعارف کرا دوں۔۔۔ تاکہ۔۔۔‘

ابھی میں جملہ مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ کار میں بیٹھ گئے اور غصے اور نفرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

جاوداں نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور میں دل ہی دل میں تلملا کر رہ گیا۔ وہ سوالیہ نظریں اور کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز عرصے تک میری آنکھوں میں چمکتی اور میرے کانوں میں گونجتی رہی اور میں نے طئے کر لیا کہ اپنے بچوں کو اس احساس میں مبتلا نہیں ہونے دوں گا جس نے میری رگوں میں زہر بھر دیا ہے۔ اب سوچتا ہوں تو مجھے اپنے اس ارادے میں خود غرضی کا جذبہ بھی شامل نظر آتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں صبح و شام ایسے کتنے دل شکن واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے بارے میں ہمارے سوچنے کا انداز ہمدردانہ سہی مگر قدرے رسمی ہوتا ہے اور ہم عملاً اس کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ شاید ہمارے انفرادی عمل سے معاشرے کے یہ مسائل حل بھی نہ ہوں۔ اس کے لیے تو اجتماعی عمل کی ایک مستقل تحریک چاہیے جس کا شعور ابھی ہمارے عوام میں نہیں۔

کراچی ویسے بھی تجارتی شہر ہے اور زیادہ تر ان لوگوں سے آباد ہے جن کا رشتہ زمین سے ٹوٹ چکا ہے۔ زمین سے رشتہ ٹوٹ جانے سے بہت سی اقدار بھی ٹوٹ جاتی ہیں اور معاشی بنیادوں کی ناہمواری انسان کو خود غرض بنانے لگتی ہیں۔ ایسے عالم میں اگر سیاسی حالات بھی متوازن نہ ہوں تو معاشرہ ایک ہمہ گیر بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے اور اٹل حقیقتوں پر اس کا یقین کمزور پڑنے لگتا ہے۔ ’ایسی صورت میں صرف تہذیب اور تاریخ ہی انسان کا سہارا بنتی ہے اور جب یہ سہارا بھی باقی نہ رہے تو انسان اپنی ذات میں محدود تر ہونے لگتا ہے اور زندگی علاقائی اور خاندانی حدود میں سمٹنے لگتی ہے۔ کراچی کے مختلف محلوں کے نام خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ شہر کتنے خانوں میں تقسیم ہے۔ اس کا تشخص اپنی اکائی کھوتا جا رہا ہے اور تہذیبی وحدت نہ ہونے کی وجہ سے مختلف اکائیاں صرف تجارتی رشتوں میں منسلک ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ رشتے سود و زیاں کی بنیاد قائم ہوتے ہیں اور ضروریات کے کچے دھاگوں میں بندھے رہتے ہیں۔

دنیا کے ہر تجارتی شہر میں رشتوں کی نوعیت یہی ہوتی ہے مگر ایسا شہر جو نو آبادکاروں سے

آباد ہو 'وادیِ سینا' کی مثال ہو جاتا ہے کہ قوم تو امت موسیٰ کہلاتی ہے اور پوجا کرتی ہے سامری کے 'گوسالہ' کی۔ جسے دیکھیے دولت کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ کراچی کا المیہ بھی یہی ہے۔

ایسے شہر میں متوسط طبقہ بڑی الجھن میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ دو پاٹوں کے بیچ دھیرے دھیرے پستا چلا جاتا ہے اور غیر محسوس طور پر ایک دن اپنا تشخص کھو بیٹھتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس تہذیب میں بھی ضم ہونے سے رہ جاتا ہے جو اس کا رشتہ نئی سرزمین سے جوڑ سکے۔ مجھ ایسے آدمی کے لیے کراچی میں اک اور بھی مسئلہ تھا۔۔۔ اور وہ یہ کہ تجارتی ماحول کی گہما گہمی اور نفسی نفسی سے دل گھبرانے لگے تو کہاں جاؤں؟ بمبئی میں جب کبھی یہ وحشت دل کا بوجھ بنتی تو بھاگ کر اورنگ آباد چلا جاتا تھا اور وہاں کی محدود اور خاموش فضا میں کچھ دن سکون کے سانس لے لیتا مگر یہاں مضافات سے کوئی ایسا تعلق نہ تھا۔ چنانچہ جب حیدرآباد سندھ میں ریڈیو اسٹیشن کھلنے کی نوید ملی تو میں پہلا شخص تھا جس نے ٹرانسفر کی درخواست دے دی اور ۱۹۵۵ء میں حیدرآباد آ گیا۔

حیدرآباد میں مجھے اپنی صلاحیتوں کو فروغ دینے کا اچھا موقع ملا۔ ریڈیو اور شہر کے ادیبوں میں ایسی یگانگت تھی کہ ہمارا ماحول ادبی محفلوں سے جگمگاتا رہتا۔ مجھے بھی گویا ایک نئی زندگی ملی تھی۔ میں بھی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔

وہ دور، لکھنے پڑھنے کے اعتبار سے میری زندگی کا اہم ترین دور تھا۔ میں نے اس دور میں نہ صرف شعر کہے بلکہ متعدد منظوم اور منثور ڈرامے بھی لکھے۔ ارژنگ کے تحت مختلف ثقافتی خدمات بھی سرانجام دیں۔ دوماہی رسالہ 'شعور' بھی شائع کیا۔ 'آگ میں پھول' کی اشاعت پر بھی اسی دوران توجہ دی اور سب سے اہم کام یہ کیا کہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کر لی۔ کچھ عرصے سچل کالج میں پڑھایا اور استاد مکرم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کے لیے اپنا تحقیقی مقالہ لکھنا شروع کر دیا۔ مگر اسے زندگی کی ستم ظریفی کہیے کہ اپنے عہد کا جبر۔۔۔ کہ معاشی مسائل نے پھر مجھے اپنے دام میں الجھا لیا اور میں نے فلموں میں نغمہ نگاری شروع کر دی۔

فلم انڈسٹری میں جانے والا ہر سنجیدہ آدمی کچھ تعمیری عزائم بھی ساتھ لیکر جاتا ہے اور اپنی دانست میں یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی تبدیلی کا عنوان بن جائے گا چنانچہ میں نے بھی نغمہ نگاری اور مکالمہ نویسی سے لے کر فلمسازی اور ہدایت کاری تک ہر شعبہ فلم کو نہایت سنجیدگی سے اپنایا اور اپنے حدود میں روایت سے کسی حد تک مختلف کام بھی انجام دیئے ان خدمات کا صلہ مجھے کچھ ایوارڈز کی صورت بھی ملا مگر رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں جو کچھ پا رہا ہوں، اس سے زیادہ کھو بھی رہا ہوں۔

ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینکنے سے کچھ لہریں ضرور پیدا ہو جاتی ہیں مگر کوئی ایسا تموج پیدا نہیں ہوتا کہ پانی کا رخ بدل جائے۔۔۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری میں ہم چند خوش فہم لوگوں کی شمولیت بھی اسی مثال کے مصداق تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لاحاصل سے زیادہ حاصل کا غم میری روح کا المیہ بن گیا۔

روٹی کے لیے طاق پہ رکھ دوں گا کتابیں
جینا مجھے اس طرح گوارا تو نہیں تھا

لٹا دیا ہے غمِ آب و تاب میں کیا کیا
وگرنہ خواب تھے چشمِ پُر آب میں کیا کیا

روشنی کے زاویوں پر منحصر ہے زندگی
آپ کے بس میں نہیں ہے آپ کا سایہ یہاں

یہ اور اس قسم کے بہت سے شعر اسی دور کی یادگار ہیں۔ جیسا کہ میں نے 'آگ میں پھول' کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں لکھا ہے۔

'سچ پوچھیے تو عمر کے یہ سنہری سال میں نے ایک ایسے برزخ میں کاٹے جس

کے بعد حقیقی ادبی زندگی کی آس ایک موہوم خوش فہمی اور خود فریبی سے زیادہ نہ تھی اور جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ مجھے اس زیاں کا احساس بھی تھا مگر یہی سوچ کے خاموش ہو رہتا کہ وقت نے یہ سنگین مذاق صرف میرے ساتھ تو نہیں کیا ہے۔ تاریخ میں میرے جیسے کتنے شاعر و ادیب اپنے حالات سے مجبور ہو کر بازار میں جا بیٹھے، چاہے وہ بازار کسی بادشاہ کے دربار میں لگا ہو یا فلمی دنیا کے مصنوعی محل دو محلوں میں۔

'میں سوچتا کہ اس جال سے نکل بھاگوں مگر جس زمین پر یہ جال بچھا ہوا تھا وہ ایک دلدل سے کم نہ تھی۔ میری ہر کوشش مجھے کچھ اور زمین میں اتار دیتی۔ ایسے عالم میں علم و ادب کے خواب طوفان سے ساحل کا نظارہ کرنے کے مترادف ہوتے اور میں ایک کربناک حسرت کے ساتھ آنکھیں بند کر لیتا'

'مٹی کا قرض' کی ترتیب کے دوران میں اسی کرب میں مبتلا تھا۔ میری آخری فلم 'گڑیا' ادھوری تھی اور میرے دل میں فلم انڈسٹری چھوڑ دینے کا ارادہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ ان دنوں کی ایک 'غزل' ؎

پندارِ یوسفی سہی، پندار ہی تو ہے
بازار کی یہ شئے سرِ بازار ہی تو ہے

میرے اندرونی خلجان اور میرے غم و غصہ کا آخری اظہار ہے ؎

میں بھی انا پرست ہوں اقرار کیا کروں
میرے لبوں پہ آج بھی انکار ہی تو ہے
(مٹی کا قرض)

اور میں اپنی فلم ادھوری چھوڑ کے فلم انڈسٹری سے باہر آ گیا اور پھر تلاش معاش میں سرگرداں ہو گیا۔ کبھی ٹیلیویژن اور کبھی مختلف کانٹریکٹ۔۔۔ جن میں نیشنل سیونگس کے نغموں سے

لے کر طباعت کے ٹھیکے تک شامل تھے۔

زندگی کی اس طویل، متنوع اور مسلسل جدوجہد میں میں نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ اس کا مختصر تجزیہ یہ ہے کہ میں تو اپنی ذات میں ادھورا رہ گیا مگر اپنے بچوں کو۔۔۔ تکمیل ذات کی خاطر۔۔۔ اعلیٰ تعلیم دلا دی۔ اب دیکھیئے ان کی زندگی انہیں کس منزل تک پہنچاتی ہے۔ میرے چار بیٹے ہیں اور چار بیٹیاں۔ (تازہ ایڈیشن کی اشاعت تک تمام بچے نہ صرف 'اعلیٰ تعلیم' سے آراستہ ہو گئے بلکہ اپنی عملی زندگی میں آ کر اپنے بچوں کو بھی اعلیٰ تعلیم سے سرفراز کر چکے ہیں) ظاہر ہے کہ یہ کامیابیاں میری تنہا کوششوں کا حاصل نہیں، میری ہر کامیابی میں حقیقی اعزاز کی مستحق میری شریکِ حیات ہے جس نے زندگی کے کٹھن سے کٹھن مرحلے میں مسکراتے ہوئے میرا ساتھ دیا اور مثالی انداز میں اپنے بچوں کی تربیت کی۔ اس پہلو سے میں جب بھی اپنے بارے میں سوچتا ہوں تو کچھ دیر کے لیے اپنی ذات کے تشنۂ تکمیل رہ جانے کا غم بھی بھول جاتا ہوں اور اپنے بچوں میں اپنی ذات کو بٹا ہوا دیکھ کر یوں خوش ہو لیتا ہوں کہ ؎

میں اِک اکائی کے مانند ہر عدد میں ہوں
(ہارون کی آواز)

یا جیسا کہ میں نے اپنی بیٹی جاوداں میر پر لکھی ہوئی نظم میں کہا ہے ؎

نئے خدوخال سے ہمارے جسد کی تشکیل ہو رہی ہے
ادھورا پن ختم ہو رہا ہے، ہماری تکمیل ہو رہی ہے
(آگ میں پھول)

بادی النظر میں اسے بھی خود فریبی کا اک بہانہ کہیے ورنہ حقیقت بہرحال اپنی جگہ ایک المیہ ہے کہ معاشی وسائل کے بہ آسانی بہم نہ ہونے کی وجہ سے کتنی ہی شخصیتیں ادھوری رہ جاتی ہیں کتنے لوگ اپنے اصلی چہرے کھو بیٹھتے ہیں اور ساری زندگی مصنوعی چہرے لگائے پھرتے ہیں۔ خدا

کاشکر ہے کہ میں زندگی کے ہاتھوں ایسا کھلونا نہیں بنا۔شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جہاں بینی کے ساتھ میں نے ہمیشہ خود بینی کو بھی مقدم سمجھا ہے اسی عمل نے مجھے نامکمل رہ جانے کا احساس دیا اور اسی عمل نے میرے اندر تکمیل کی لگن کو ابھی تک تازہ رکھا ہے۔

'تشنگی کا سفر' میری زندگی کا بھی استعارہ ہے اور میری شاعری کا بھی۔شاعری میں نظم، غزل اور ثلاثی کے علاوہ طویل نظمیں اور منظوم اور نثری ڈرامے بھی میرے تخلیقی اضطراب کے ضامن ہیں یہ اور بات کہ اپنی بیشتر تخلیقات پر میں عرصہ دراز تک نظر ثانی کر سکا نہ انہیں طباعت کے لیے دے سکا۔اب اس طرف توجہ کی تو اپنی 'مجرمانہ غفلت' کا احساس ہوا۔

فی الحال جو کتابیں مرتب کی ہیں ان میں 'آگ میں پھول' اور 'تشنگی کا سفر' ایک ساتھ طبع ہو رہی ہیں۔ دوسری کتابیں بھی انشاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آ جائیں گی۔ 'تشنگی کا سفر' (حسب ترتیب) دو افسانوی اور دو تمثیلی نظموں پر مشتمل ہے۔افسانوی نظمیں 'شعلۂ بے دود' اور 'بنگال سے کوریا تک'۔۔۔'آگ میں پھول' کے پہلے ایڈیشن ۱۹۵۶ء میں شامل تھیں۔دوسرے ایڈیشن سے یہ نظمیں نکال کر میں نے طویل نظموں کے اس مجموعے میں شامل کر دی ہیں۔'شعلۂ بے دود' ۵۲ء میں لکھی گئی تھی اور اسی سال 'ادب لطیف' لاہور جولائی کے شمارے میں شائع ہوئی۔'بنگال سے کوریا تک' ۵۲ اور ۵۴ کے دوران لکھی گئی اور اس کے مختلف حصے کراچی کے مختلف رسائل۔۔۔

اردو کالج کے مجلّہ 'برگِ گل' (پہلا شمارہ ۱۹۵۲ء) مرتبہ، ابن انشاء اور اے آر ممتاز

ماہنامہ 'مشرب' (مئی ۱۹۵۳ء) ایڈیٹر، اختر انصاری اکبر آبادی

ڈائجسٹ 'روحِ ادب' (۱۹۵۳ء) مرتبہ، پروفیسر ممتاز حسین

ماہنامہ 'سیارہ' (ستمبر ۱۹۵۳ء) ایڈیٹر، پروفیسر ممتاز حسین اور

'نیا دور' (شمارہ ۳،۴) ایڈیٹر، جمیل جالبی میں شائع ہوتے رہے۔

بعد ازاں پوری نظم وامق جونپوری کے زیر ادارت ماہنامہ 'شاہراہ' دہلی کے شمارہ نمبر ۳

(بسلسلہ سالنامہ) مارچ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ پھر یہی نظم ۱۹۶۲ء میں ساہتیہ اکیڈیمی حیدر آباد (آندھرا پردیش) کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتاب 'حیدر آباد کے شاعر' کی جلد دوم میں سلیمان اریب نے منتخب کی۔اس نظم کا موضوع 'جنگ' ہے اور یہ دوسری جنگ عظیم کے پس منظر سے شروع ہو کر کوریا کی لڑائی (تیسری جنگ عظیم کے امکانات) پر ختم ہوتی ہے۔

'آگ میں پھول' کے پہلے ایڈیشن میں 'میں اور میرا فن' کے زیر عنوان اپنے مضمون میں چند باتیں میں نے اس نظم کے بارے میں بھی لکھی تھیں۔

'تکنیک کے اعتبار سے میں نے اس میں ایک تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے۔۔۔اکثر جگہ کیفیات کے اظہار میں میں نے اس میں 'مسلسل غزل' کی تکنیک استعمال کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ نظم کے اندازِ بیان میں ایک خاص ملائمت پیدا ہوگئی ہے۔یہ ملائمت ایک ایسی نظم کے لیے بہت ضروری تھی جس میں کہانی یادداشت کے طور پر ابھرتی ہو۔۔۔یہ نظم ایک اور طریقے سے بھی کہی جا سکتی تھی، یعنی مثنوی کے انداز میں۔۔۔لیکن چونکہ میرا موضوع ایک تاریخی المیے سے اکتسابِ فکر کرتا ہے اس لیے کہانی کے تسلسل سے زیادہ اُن مخصوص واقعات کو میں نے اہمیت دی جو نظم کے بنیادی خیال کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

ایک اور بات جو آپ اس نظم میں محسوس کریں گے۔ایک 'تاریخی غلطی' ہے۔جب اس کہانی کا مرکزی کردار میدان جنگ سے اپنے وطن بنگال واپس آتا ہے تو وہاں قحط کی تباہیاں دیکھتا ہے۔حالانکہ بنگال میں قحط ۱۹۴۲ء میں پڑا تھا اور گزشتہ عالمگیر جنگ ۴۵ء میں ختم ہوئی۔تین سال کے عرصہ میں ظاہر ہے کہ قحط کے آثار اُس طرح باقی نہیں رہے ہوں گے جس طرح نظم میں پیش کئے گئے ہیں مثلاً ؎

میرے ٹیگور کی زمیں پر آج
لاشوں ڈھانچوں کا بس گیا تھا جہاں

اس قدر تھا کریہہ ہر منظر
جیسے قئے کر چکا ہو قبرستاں

دراصل بنگال کے قحط کا جنگ سے تعلق میرا بنیادی موضوع ہے اور یہ واقعہ ہے کہ بنگال کا قحط قدرتی نہیں بلکہ 'مصنوعی' تھا اور اس کا عالمگیر جنگ کی تباہ کاریوں سے بھی 'ایک تعلق' ضرور تھا خیر، میری نظم میں بنگال اور کوریا جغرافیائی حدود کے پابند رہ کر بھی ایک سمبل کے طور پر آئے ہیں۔ بنگال ۔۔۔ایک ایسا مقام جو جنگ سے دور رہ کر بھی اُتنا ہی تباہ ہو گیا جتنا کوریا۔۔۔یعنی تازہ ہیروشیما۔۔۔اس بنیادی خیال کے پیش نظر میں نے چند برسوں کے فرق کو نظر انداز کر دیا جو بہت ضروری تھا'۔

تمثیلی نظموں میں 'بدلتے زاویئے' (تمثیلی غنائیہ) ۵۷ء یا ۵۸ء میں لکھا گیا تھا اور اُنہیں دنوں ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے (قدرے ترمیم کے ساتھ) نشر بھی ہوا لیکن ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

'شکست کی آواز' (ایک کرداری تمثیلی نظم) ۱۹۶۲ء میں لکھی گئی تھی اور 'فریب آگہی' کے نام سے دو تین بار نشر ہو چکی ہے۔ اشاعت کے لیے دیتے وقت جب میں نے اس پر نظر ثانی کی تو اس کا عنوان بدل دیا چنانچہ ۱۹۶۵ء میں یہ نظم 'شکست کی آواز' کے عنوان سے 'فنون' لاہور میں شائع ہوئی۔ اس تمثیلی نظم کا بنیادی خیال ایک فرانسیسی ادیب 'مارسل بائنل' کی کہانی سے ماخوذ ہے۔

'تشنگی کا سفر' میں اِن نظموں کو شامل کرتے وقت میں نے 'خوب سے خوب تر کی جستجو میں' کہیں کہیں کچھ تبدیلیاں بھی کر دی ہیں جسے 'خود تنقیدی' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

حمایت علی شاعر

شعبۂ اردو ۱۹۸۰ء
سندھ یونیورسٹی، جام شورو

شعلۂ بے دُود

(صیغۂ واحد متکلم میں ایک طویل افسانوی نظم)

(مطبوعہ 'ادب لطیف' لاہور۔ جولائی ۱۹۵۲ء)

متوسط طبقے کے ایک نوجوان کی کہانی
جو ممکن ہے میری اور آپ کی داستان نہ ہو
مگر وہ 'تیسرا شخص' جو ہمارے اندر چھپا بیٹھا ہے
شاید اس کہانی میں اسے اپنا کردار نظر آ جائے

اُس کی نظروں کی خواب گاہوں میں
بجلیاں سو رہی تھیں، کیا معلوم
میں نے یوں ہی ذرا جگایا کیا
زندگی کا بدل گیا مفہوم

کیا خبر تھی جبیں کی شکنوں میں
اب بھی کوئی کرن ہے سوئی ہوئی
عارضوں کی اترتی دھوپ میں بھی
چاندنی کی چبھن ہے سوئی ہوئی

زلف، جس طرح مقبروں کی شام
ہونٹ، جس طرح کاغذی کلیاں
روپ، جس طرح پچھلی شب کا چاند
سر سے پا تک سکوت کا عنواں

کیا خبر تھی کہ اس خموشی میں
موج در موج ہے کوئی طوفاں
اس مجسم خزاں کے خوابوں میں
جاگتے ہیں بہار کے ارماں

لرزش لب میں گفتگو کی امنگ
کروٹیں لے رہی ہے میرے لیے
بجھتی نظروں کے طاق میں، دل کی
شمع، لو دے رہی ہے میرے لیے

میری نظروں کی شوخیء گفتار
خامشی کا طلسم توڑ گئی
دل کی دھڑکن لجائی شرمائی
اک تبسم لبوں پہ چھوڑ گئی

اس نے مجھ سے کہا تو کچھ بھی نہیں
اک تبسم تو اس کی بات ہی کیا
میں نے ہنس کر جواب دے بھی دیا
اور عورت کی کائنات ہی کیا

میں کہ میری نظر، مرا ادراک
زیست کے کہنہ فلسفوں کا شکار
میرے نزدیک ارتقاء کا کمال
زندگانی کا تاجرانہ وقار

وہ کہ بے آب و رنگ اک تصویر
اپنے سینے میں جان رکھتی تھی
خاکِ پا بھی نہ ہو کے، پاؤں تلے
سیکڑوں آسمان رکھتی تھی

میری اِک چھیڑ، ایک کھیل ہی تھا
ٹوٹے تاروں سے راگ پھوٹ پڑے
میری نظروں سے چھپ کے دور کہیں
چند تارے فلک سے ٹوٹ پڑے

مسکراہٹ نے اشک پی پی کر
راز کتنے چھپائے کیا معلوم
آنکھوں آنکھوں میں دل کی دھڑکن نے
گیت کتنے سنائے کیا معلوم

میری ویران خلوتوں کا سکوں
اپنی غربت سے برسرِ پیکار
اس کی تنہائیوں کے سہمے خواب
کھلتی مرجھاتی غنچگی کے دیار

اور آخر کھنکتے سکوں کی
خواب گوں لے سلا گئی مجھ کو
میرے ماحول کی بکھرتی گرد
اپنی چادر اڑھا گئی مجھ کو

دور نظروں میں جنت زر کا
اِک دریچہ کہیں سے کھل ہی گیا
میرے احساس کے تقدس میں
نظم دوراں کا زہر گھل ہی گیا

پیش و پس کے اداس ویرانے
رنگ و نکہت کے شہر تھے جیسے
کاسۂ نیلگوں میں رقص کناں
چاند تاروں کے روپئے پیسے

میری مسجود، اِک بُتِ طناز
زرگر وقت کا نیا شہکار
جس کے قدموں میں مہر و ماہ و نجوم
جس کے پیکر میں بس گئی تھی بہار

زلف، جس طرح میکدے کی شام
ہونٹ، لالے کی آدھ کھلی کلیاں
روپ، جس طرح چودھویں کا چاند
سر سے پا تک حیات کا عنواں

جب کبھی وہ قدم اٹھاتی تھی
کہکشاں راستہ بنا دیتی
جس طرف بھی نگاہ کر لیتی
برق شرما کے منہ چھپا لیتی

بات کرتی تو پھول ہنس پڑتے
مسکراتی تو صبح ہو جاتی
گنگناتی تو ساز بج اٹھتے
زندگی میٹھی نیند سو جاتی

خلوتوں کی خموش گفتاری
جلوہ گاہوں کے راز کی غماز
حرمِ خاص میں کھنکتے جام
ناچتے گاتے میکدوں میں نماز

میری نظروں کے عکس زاروں میں
ایک جنت خرام فرما تھی
کعبۂ دل میں خم بدوش کوئی
دخترِ زر قیام فرما تھی

دختر زر کہ جس کے ہونٹوں پر
روپیوں کی کھنک بکھرتی ہوئی
دختر زر کہ جس کی آنکھوں میں
روپیوں کی چمک نکھرتی ہوئی

دختر زر کہ جس کی زلفوں پر
روپئے، کہکشاں لٹاتے ہوئے
دختر زر کہ جس کے نقش قدم
روپئے، ڈھالتے بناتے ہوئے

میں کہ میری نظر، مرا ادراک
ڈھلتے سکوں کے شور میں بے خواب
مجھ کو معلوم کیا کہ کس دل کی
خلوتیں ہیں مرے لیے بے تاب

میرے خوابوں میں کب سے رقص کناں
میرے مسجود کی جوانی تھی
بھاؤ چڑھتے اترتے جاتے تھے
جرأت اک اور آزمانی تھی

مجھ کو معلوم کیا کہ میرے لیے
کس کے عارض پہ کھل رہے ہیں گلاب
میری خاطر سنورتا جاتا ہے
کوئی غربت گزیدہ مست شباب

مجھ کو معلوم کیا کہ میری نظر
کس کے ہونٹوں پہ بن گئی ہے کرن
کس کی تنہائیوں کی ویرانی
میری خاطر بنی ہوئی ہے دلہن

میری ہلکی سے مسکراہٹ نے
کس کی راتوں کو بخش دی ہے سحر
مجھ کو معلوم کیا کہ میرے لیے
ٹوٹتے ہیں پلک پلک سے گہر

کس کے خوابوں میں کوئی تاج محل
سہما سہما ابھرتا آیا ہے
اور پھر یک بہ یک نہ جانے کیوں
دل دھڑکتے ہی ٹوٹ جاتا ہے

میں کہ میرے شعور کا خورشید
زر پرستی کی ظلمتوں کا شکار
میرے آفاق پر محیط ۔۔۔ فقط
دختر زر کا سیمگوں پندار

باتوں باتوں میں ایک دن یونہی
میرے خوابوں سے وہ اتر آئی
ذکر چھڑنا ہی تھا کہ ہونٹوں پر
روپیوں کی کھنک ابھر آئی

مجھ کو معلوم کیا کہ تاج محل
کس کے اشکوں میں ڈوب کر ابھرا
کس امارت نے، کس غریبی کے
دل سے سارا لہو نچوڑ لیا

ایک غربت گزیدہ مست شباب
خامشی سے نگاہ موڑ گئی
اس نے مجھ سے کہا ت کچھ بھی نہیں
اک تبسم لبوں پہ چھوڑ گئی

وہ تبسم کہ مستقل اک طنز
بادشاہی کی روتی آنکھوں پر
وہ تبسم کہ جس کی تابانی
صرف ہوتی رہی ہے تاجوں پر

وہ تبسم کہ جس کی زندہ لاش
دفن کر دی تھی میں نے ہونٹوں میں
وہ تبسم کہ ہو گیا تحلیل
زرگری کے طفیل اشکوں میں

اشک، دل کے مزار کی شمعیں
اشک، طغیانیوں کا ساکت جوش
اشک، تابوت مسکراہٹ کے
دوشِ مژگاں پہ منجمد، خاموش

روپئے، چاند سی، ہتھیلی میں
مجھ کو جنت نئی دکھاتے رہے
میرے برخود غلط تفکر کو
زرگری کا سبق پڑھاتے رہے

بھاؤ چڑھتے رہے اترتے رہے
بات بن بن کے ٹوٹ جاتی رہی
میری جنت مری نگاہوں سے
دور جاتی قریب آتی رہی

اک خدائے زمیں نے آخر کار
اپنی باہوں میں اس کو بھینچ لیا
میں خلاؤں میں جھولتا ہی رہا
اور روپئے نے روپئے کو کھینچ لیا

میں نے اس سے کہا تو کچھ بھی نہیں
خامشی سے نظر کو پھیر لیا
اور پھر یک بہ یک مرے دل کو
سیکڑوں آنسوؤں نے گھیر لیا

اشک، دل کے مزار کی شمعیں
اشک، طغیانیوں کا ساکت جوش
اشک، تابوت مسکراہٹ کے
اشک، غربت کی آتشِ خاموش

اشک جن کی چمک پہ سکوں کی
تابناکی نے دھند برسا دی
اشک جن کے خنک شراروں نے
میری رگ رگ میں آگ دوڑا دی

آگ، لاشوں کے قلب کی دھڑکن
آگ، پیہم سکوت کا طوفاں
آگ، محرومیوں کی تشنہ لبی
آگ، غربت کا آخری ارماں

اور یہ آگ کر گئی روشن
مجھ پہ تاریخ کے مقدس راز
ہر گناہ عظیم کے پیچھے
کس خدا کا ہے دستِ کار دراز

کس نے فکر و شعور کی پرواز
آتشیں منزلوں میں برفا دی
آفتابی نگاہ کی تقدیر
چند تاروں کی ضو میں الجھا دی

ایک غربت گزیدہ مست شباب
خامشی سے نگاہ موڑ گئی
کچھ نہ کہہ کر بہت سی باتوں کو
تھر تھراتے لبوں پہ چھوڑ گئی

وہ چلی تو گئی مگر اب تک
آہٹ آہٹ پہ دل دھڑکتا ہے
بجھ گئی انتظار کی ہر شمع
دل میں اک شعلہ سا بھڑکتا ہے

بنگال سے کوریا تک

(صیغۂ واحد متکلم میں ایک طویل ترین افسانوی نظم)

(مطبوعہ 'شاہراہ' دہلی۔ سالنامہ مارچ ۱۹۵۴ء)

یہ کہانی آپ بیتی نہیں، لیکن آپ بیتی ہوسکتی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار 'میں' میں بھی ہوسکتا ہوں اور آپ بھی۔۔۔ کیونکہ گزشتہ عالمگیر جنگ میں بنگال، جنگ سے دور رہ کر بھی لاکھوں انسانوں کا مدفن بن گیا اور کوریا۔۔۔ تازہ ہیروشیما ہے اور یہ ہیروشیما جتنی تیزی سے پھیلتا جائے گا، بنگال کی وسعتوں میں بھی اسی سرعت سے اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس پس منظر کی روشنی میں اس کہانی کا مرکزی کردار 'انفرادی' ہونے کے ساتھ ساتھ ایک 'اجتماعی کردار' بھی ہے۔

اور آج نئی عالمگیر جنگ کا ہولناک اندیشہ
دنیا کے ہر انسان کے دل میں
ایک سوالیہ علامت بن گیا ہے

کیا ہماری نئی نسل بھی جنگ کا ایندھن بن جائے گی؟

یادوں کے غبار میں

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھر تھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ مرا گاؤں --- میرا اپنا وطن
میری جنت --- مرا جہنم زار
چند اونچی حویلیوں کے گرد
زندہ لاشوں کی تربتوں کا دیار
سبز شاداب کھیتیوں کے بیچ
بھوکی ننگی حیات کا بازار
ارتقائے جہاں کی پستی کے
ہر فریب حسیں کا آئینہ دار
حسن فطرت کا سادہ لوح امیں
زرگزیدہ سماج کا شہکار

اسی جنت --- اسی جہنم میں
غنچے چٹکے، کھلے، گلاب ہوئے
اسی چھاؤں کی نرم حدت میں
ذرے تپ تپ کے آفتاب ہوئے

نوجوانی کہ موج طوفاں جوش
نوجوانی کہ آندھیوں کا خروش
پتھروں کی رگوں میں کھولتی آگ
زندگی کے لہو کا نقطۂ جوش
ایک فرزانگی --- جنوں کی سی
ایک دیوانگی --- بقیدِ ہوش
ایک بے چینی، پُرسکوں، شیریں
اک سکوں اضطراب درآغوش
ایک خاموشی --- اپنے شور میں گم
ایک غوغا مگر بہت خاموش

کس قدر تھے حسین وہ دن رات
کتنا دلکش تھا زندگی کا روپ
ایک ہی بات تھی مرے نزدیک
چاندنی ہو کہ چلچلاتی دھوپ

جہل زائیدہ فکر و احساسات
پتھروں کو نگیں سمجھتے رہے
اک مقدس فریب میں آ کر
آسماں کو زمیں سمجھتے رہے
ہر توہّم کے آستانے پر
سجدہ ریزی کو دیں سمجھتے رہے
چیتھڑوں کے کفن میں دفنا کر
زندگی کو حسیں سمجھتے رہے
اشک پی پی کے مسکراتے رہے
زہر کو انگبیں سمجھتے رہے

کس کو معلوم ـ ـ ـ کوئی کیا جانے
کس نے لوٹی حیات کی تقدیس
کن خداؤں کے جال میں ہے اسیر
لیلیٰ کائنات کی تقدیس

ایک مسرت ایک موت

آئینہ خانہ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ مری سانولی سلونی شام
میری آباد شامِ تنہائی
اپنے ہی دل کی دھڑکنوں پر جب
زندگی پہلی بار شرمائی
مچلی مچلی سی آرزوؤں کو
لوریاں دے رہی تھی شہنائی
میرے خوابوں کے اجڑے کھیتوں میں
ہنستے گیتوں کی فصل لہرائی
ٹوٹی پھوٹی سی ایک کٹیا میں
کہکشاں کی برات اُتر آئی

کس قدر تھے عجیب وہ لمحات
کتنے یک رنگ، کس قدر متضاد
کتنے خاموش، کتنے طوفانی
کتنے پابند، کس قدر آزاد

سوئی سوئی سی ایک بیداری
صبح سے تابہ شام رہتی تھی
نوجوانی کے خواب زاروں میں
عمر محوِ خرام رہتی تھی
اپنا ساقی تھا، اپنا مے خانہ
زندگی غرقِ جام رہتی تھی
شام ہوتی تھی صبح میرے لیے
اور سویرے سے شام رہتی تھی
دوش و فردا سے بے خبر یوں ہی
زندگانی مدام رہتی تھی

کیا خبر تھی کہ ہر بہار کے ساتھ
خار و گل ساتھ ساتھ ہوتے ہیں
عیش و غم زندگی کے بستر پر
ساتھ اٹھتے ہیں، ساتھ سوتے ہیں

ایک جھٹکے میں ٹوٹ ٹوٹ گئے
خود فریبی کے کیف آگیں خواب
بادِ صرصر نے نوچ کر رکھ دی
شبنمی شبنمی قبائے گلاب
ہو گئے چور اک تھپیڑے میں
موج ساحل پہ رقص کرتے حباب
شب نے انگڑائی بھی نہ لی تھی ابھی
زرد پڑنے لگا رخ مہتاب
بھوک کی آگ اتنی تیز ہوئی
رہ گیا گل کی پتھروں کا شباب

زندگی اپنا ہر بناؤ سنگھار
ایک دوکان پر اتار آئی
جھڑ گیا شاخ گل سے ایک اک پھول
میرے گلشن میں جب بہار آئی

غمِ حاصل

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ پسینے میں غرق صبح و شام
نوجوانی کے جرم کی پاداش
ہر نفس اپنے سوز میں غلطاں
ہر نظر رہگزارِ فکر معاش
رات کو فکر صبح کھائے ہوئے
صبح کو ایک نان شب کی تلاش
دل میں بے تاب حسرتوں کا ہجوم
روح میں خار مفلسی کی خراش
نوجوانی ۔۔۔ کہ موج طوفاں جوش
نوجوانی ۔۔۔ کہ ایک زندہ لاش

میرے ادراک کے اندھیرے میں
کتنے دیپک سلگ سلگ کے بجھے
راہ میں کتنے سنگ میل آئے
کوئی رستہ دکھا سکا نہ مجھے

میں کہ میرا ضمیر بھی محکوم
میرا احساس، میری فکر غلام
مجھ کو کیا علم ۔۔۔ کتنا اونچا ہے
بزمِ فطرت میں آدمی کا مقام
میری ہر صبح ۔۔۔ ایک صبح حیات
میری ہر شام ۔۔۔ زندگی کی شام
ہو رہے زندگی ہی جب اک موت
کیوں نہ کرتا میں موت ہی کو سلام
پائلی ٥ چاولوں کے بدلے میں
بیچ دی میں نے اپنی عمر تمام

اِک بگل کی صدا پہ رقصاں تھی
میری فکر و نگاہ ۔۔۔ میری جبیں
دل تو ویسے بہت تھا خوش لیکن
میں کہیں تھا ۔۔۔ میری حیات کہیں

٥ بنگال میں اناج کا ایک ناپ

جنگ، تہذیب کا نشاں تھامے
سارے عالم پہ چھائے جاتی تھی
دل میں کانٹے، لبوں پہ پھول کھلائے
خوں مسلسل بہائے جاتی تھی
صبح فردا کا واسطہ دے کر
شب کی ظلمت بڑھائے جاتی تھی
جھونپڑوں کے چراغ گل کر کے
شہر کے شہر کھائے جاتی تھی
مستقل امن کی قسم کھا کر
زندگی کو مٹائے جاتی تھی

میں کہ جاہل غریب اک دہقاں
مجھ کو اسرار دہر کیا معلوم
ہاں بس اتنا یقین تھا مجھ کو
وہی ہو گا جو ہے مرا مقسوم

وداع

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ اداسی، وہ خامشی، وہ سکوت
کتنی چیخوں کو زیرِ حلق دبائے
لب تک آ آ کے لوٹتا ہر لفظ
ایک انجانے خوف سے تھرائے
ذرے ذرے پہ اپنے خونی دانت
کچکچاتے ہوئے بھیانک سائے
درد چیخوں کا شور لے کے اٹھے
اور ہونٹوں پہ آہ میں ڈھل جائے
دل کی دھڑکن تڑپ کے سر پیٹے
آنکھ چپ چاپ اشک پیتی جائے

کس قدر تھا مہیب وہ منظر
کیسے کیسے خیال دل میں آئے
گھر کے پرہول، اداس کونوں میں
زندگی جھانکتے ہوئے گھبرائے

اور پھر جب مرے لرزتے ہونٹ
ماں کے قدموں کو چومنے کو جھکے
کتنے نالوں کا جاگ اٹھا شور
کتنے لاوے تڑپ کے پھوٹ پڑے
چیخیں ٹکرائیں آ کے چیخوں سے
بہنیں بھائی لپٹ گئے مجھ سے
آسمانوں پہ وار کرتی رہی
ماں کلیجے سے مجھ کو چمٹا کے
اور اک نوجوانی روتی رہی
لگ کے چپ چاپ ایک کھمبے سے

میں کہ ہر چوٹ سہہ گیا چپ چاپ
اپنے سینے پہ رکھ لیے پتھر
سارے گھر کی مسرتوں کے لیے
اپنے دل میں چبھو لیے نشتر

میں چلا تو گیا، مگر یہ اشک
ہر قدم میرے ساتھ آئے
چیخیں کانوں میں گونجتی ہی رہیں
دل نہ بہلا کسی کے بہلائے
ایک لمحہ بھی گر ملے خاموش
گھر کا گھر آنکھ میں سمٹ آئے
بوڑھی عورت کو دیکھ کر سرِ راہ
روح کچھ پیچ و تاب سی کھائے
سوچتے سوچتے نہ جانے کیوں
آنکھ بھر آئے، دل لرز جائے

اور میں اپنے دل کو تھامے ہوئے
زہر پیتا رواں رہا چپ چاپ
دودھ میں دھوئی مامتا کا پیار
رہ گیا چیختا ہوا چپ چاپ

جنگ کے میدان میں

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا جاتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ برستے لپکتے شعلوں میں
دوڑتے، چیختے، چٹختے سر
دیوہیکل گرجتے طیارے
خاک برسر دھواں دھواں منظر
سڑتی گلتی کریہہ لاشوں کے
خون میں تر ہر ایک راہگزر
دل کو اپنی خبر نہ اوروں کی
بہکی بہکی ہوئی ہر ایک نظر
شام زخموں سے چور چور نڈھال
صبح کے لب خموش آنکھیں تر

جس طرف بھی نگاہ پڑ جاتی
موت منہ پھاڑے بڑھتی آتی تھی
زندگی کے حسیں گلابوں کو
اپنے پیروں سے روند جاتی تھی

ہر طرف تھے ہزارہا انساں
اور ہر سو --- مہیب تنہائی
ناگ کی طرح خوف پھن پھیلائے
ذہن مبہوت، آنکھ پتھرائی
آہٹ آہٹ پہ وہ دہلتے دل
کس پہ کیا جانے کیا گھڑی آئی
گونج اٹھی فضا میں کوئی چیخ
اور نظروں میں موت ابھر آئی
چھپتی پھرتی تھی کونے کونے میں
زندگی سہمی سہمی گھبرائی

موت کی زد میں آرزوئے حیات
دل میں کتنی شدید ہوتی ہے
کیا خبر ان کو جن کی ہر ساعت
زندگی کی نوید ہوتی ہے

میں بہ ہرگام سوچتا رہتا
میں کہاں ہوں؟ میری حیات کہاں؟
میری دلہن کہ جس کے سینے میں
مامتا کا غرور ہے پنہاں
اور میری بہن کہ جس کے خواب
جانے کن جنتوں میں ہیں رقصاں
جس کی خاطر اٹھا کے رکھا ہے
ماں نے اپنے جہیز کا ساماں
زہر کس طرح پی رہے ہوں گے
ان کے دل کے نئے نئے ارماں

اور یکلخت اک دھماکے سے
دل کی دنیا دہل دہل جاتی
ٹوٹ جاتا ہر اک یقین حیات
زندگی موت سے بدل جاتی

آگ میں پھول

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ مری صبح میری شام حیات
وہ سرِ شب سے صبح کی تگ و تاز
وارڈ کے مرگ اثر سکوت کا شور
زندگانی سے پیار کا غماز
دم بہ دم ڈوبتی ہوئی نبضیں
دم بہ دم تیز، سوچ کی پرواز
کوئی اپنا نہ کوئی بیگانہ
زندگی پھر بھی گوش بر آواز
خشک ہونٹوں کے چیختے کشکول
کوئی یزداں نہ اہرمن دم ساز

کیا خبر تھی کہ ایسے عالم میں
زندگی مسکرا بھی سکتی ہے
موت کے جھکڑوں کی یورش میں
شمع کوئی جلا بھی سکتی ہے

میری ویران خلوتوں سے دور
میرے گھر میں بہار آئی تھی
زندگی اپنی رفعتوں کا جمال
ایک عورت پہ وار آئی تھی
موت کی زد میں دیکھ کر مجھ کو
نقش اک اور ابھار آئی تھی
اپنے شعلوں میں آپ تپ تپ کر
حسن اپنا نکھار آئی تھی
ایک دنیا کو مٹتا پا کے یہاں
ایک دنیا سنوار آئی تھی

کیا بتاؤں کہ اس گھڑی دل میں
کتنے نشتر نہ گڑ گئے یک لخت
کتنی کلیاں چٹک کے پھول ہوئیں
کتنے گلشن اجڑ گئے یک لخت

میں بصد ضبط و اختیار تمام
کچھ عجب کش مکش میں تھا غلطاں
اک طرف موت کا بھیانک خوف
اک طرف دل کے نت نئے ارماں
سوچتا تھا کہ کس لیے آخر
ہم ہیں آپس میں یوں حریفِ جاں
ہم میں کیا دشمنی ہے جس کے لیے
خوں اگلتا ہے جنگ کا میداں
زندگی کے سبھی ہیں شیدائی
میں بھی انساں ہوں، وہ بھی ہیں انساں

کتنی مجبور بربریت پر
آج انسانیت اتر آئی
چند سکوں میں بیچ کر خود کو
زندگی آج تو کدھر آئی!

جب شعلے بجھ گئے

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ صبا کے لطیف جھوکوں میں
چہچہاتی ہوئی سحر کی نمود
تیرگی دم بہ دم سمٹتی ہوئی
دم بہ دم پھیلتے شفق کے حدود
روشنی کا نشاں اٹھائے ہوئے
ہر کرن کا وہ فاتحانہ ورود
رات کے مورچے پہ لہراتا
صبح کے دل کا شعلۂ بے دور
ظلمتوں میں بھٹکتے نقش قدم
پا گئے اپنی منزل مقصود

وقت کی گود سے عروس حیات
صحن گیتی میں پھر اتر آئی
ارتقا کے سسکتے ڈھانچے کی
ڈوبی ڈوبی سی نبض ابھر آئی

نوجوانی کے بکھرے بکھرے خواب
پھر سنورنے لگے نگاہوں میں
زندگی کی امنگ پھر اک بار
سانس لینے لگی کراہوں میں
جگمگائے تبسموں کے چراغ
بجھتی نظروں کی خانقاہوں میں
دل کی دھڑکن مچل کے ناچ اٹھی
آرزوؤں کی جلوہ گاہوں میں
یوں خراماں تھے نوجواں جیسے
صف بہ صف گلستاں ہوں راہوں میں

میں کہ میرے دھڑکتے سینے میں
جیسے کلیاں چٹک رہی تھیں کہیں
دور حدِ نگاہ سے بھی دور
میری نظریں بھٹک رہی تھیں کہیں

چند سکوں کی اجلی چاندی میں
کتنے خوابوں کی صبح تھی خنداں
کتنے چڑھتے دنوں کی شانِ جمال
کتنی راتوں کی مانگ کی افشاں
کتنی محجوب پائلوں کی چھنک
کتنے گیتوں کی نغمگی تھی نہاں
ہنستے کھیتوں کا لہلہاتا شباب
کٹتی فصلوں کا گنگناتا سماں
دل کی دھڑکن میں جھولتے رہتے
کیسے کیسے اچھوتے سے ارماں

میرے ہاتھوں میں آ گئی تھی آج
میرے ایک ایک خواب کی تعبیر
ٹوٹی پھوٹی سی ایک کٹیا میں
رشک کرتی تھی خلد کی تقدیر

اپنا وطن

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ مرا دیس ۔۔۔ وہ مرا بنگال
وہ مسلسل بغاوتوں کا وطن
دھان کے کھیت میں سلگتے ہوئے
لوک گیتوں، کہاوتوں کا وطن
بپھری موجوں کی زد میں خیمہ زن
ہنستی گاتی مشقتوں کا وطن
کچی مٹی کے تاج محلوں میں
سانس لیتی محبتوں کا وطن
ہر فریب حسیں میں آئی ہوئی
بھولی بھالی عبادتوں کا وطن

جس قدر میں قریب آتا تھا
فاصلہ اور بڑھتا جاتا تھا
دل میں بیتاب آرزؤں کا
سیل مواج چڑھتا جاتا تھا

سوچتا تھا ۔۔۔ مرے قدم لینے
مہکی مہکی، ہوائیں آئیں گی
بھیگی پلکوں، لرزتے ہونٹوں کی
تھرتھراتی دعائیں آئیں گی
چاند تاروں کی آرتی لے کر
ناچتی اپسرائیں آئیں گی
میرے زخموں کی پیپ دھونے کو
بھیگی بھیگی گھٹائیں آئیں گی
نت نئے گیت گنگناتی ہوئی
بانسری کی صدائیں آئیں گی

کس کو معلوم جنگ کا میداں
کس کی دنیا کو خون دیتا ہے
اور کس کے جہان کو یکسر
اپنے شعلوں میں بھون دیتا ہے

میں تھا اپنے وطن میں اور وطن
سڑتی لاشوں کی ہڈیوں کا دیار
دل کو اپنے گلے لگائی ہوئی
سوکھی بے جان پسلیوں کا دیار
پائلی دھان کے عوض سرِ عام
بکتی ماؤں کا بیٹیوں کا دیار
گھر کی ویرانیوں پہ مہر بہ لب
گرد آلود ڈھیکیوں ۰ کا دیار
جن کی فصلوں سے قحط پھوٹ پڑا
ایسی شاداب کھیتیوں کا دیار

میرے ٹیگور کی زمیں پر آج
لاشوں ڈھانچوں کا بس گیا تھا جہاں
اس قدر تھا کریہہ ہر منظر
جیسے قئے کر چکا ہو قبرستاں

۰ بنگال میں 'چکی' کو کہتے ہیں

اپنا گھر

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ مرے گھر میں میرا پہلا قدم
وہ یکایک شکستِ دل کا سماں
جیسے یک لخت اک دھماکے سے
ریزہ ریزہ سا ہو گیا ہو جہاں
بام و دیوار و در کی خاموشی
ایک معلوم خوف سے لرزاں
کونے کونے سے کوئی شکل مہیب
آنکھیں پھاڑے مری طرف نگراں
ذرے ذرے سے جھانکتی ہوئی موت
اپنے تازہ شکار پر خنداں

چند سکے تھما کے ہاتھوں میں
داؤں غربت پہ چل چکی تھی بھوک
جھونک کر مجھ کو جنگ کے منہ میں
سارے گھر کو نگل چکی تھی بھوک

ایک میری بہن ہی باقی تھی
اپنے سینے سے اپنی لاش لگائے
میری بچی کے دودھ کی خاطر
اپنی تقدیس کی دکان سجائے
اپنے احساس کے سنپولوں کو
میری آمد کی آس سے بہلائے
اپنی غیرت کے ہر تقاضے کو
اپنے سینے کی قبر میں دفنائے
ایک ناکردہ جرم کا حاصل
اک گنہ کا عظیم بار اٹھائے

میرے آتے ہی جانے کس لمحے
وہ بھی مجھ سے بچھڑ گئی چپ چاپ
جیب میں روپے کھنکتے رہے
میری دنیا اجڑ گئی چپ چاپ

میری آنکھیں تو خشک تھیں لیکن
تہہ نہ پاتے تھے کھولتے جذبات
تھرتھراتے ہوئے لبوں کا سکوت
چیخ کر کہہ رہا تھا دل کی بات
کون یزداں ہے اہرمن اوصاف
کس نے دی زندگی کو یہ سوغات
کیسی دنیا ہے آدمی کو قبول
جس میں انساں ہیں بدتراز حشرات
ہے یہ کیسا نظامِ زیست کہ جو
چوس لیتا ہے آپ خونِ حیات

جی میں آتا تھا ۔۔۔ توڑ کر ہر بند
ایک اک قید سے نکل جاؤں
ایک شمشیر آب دار کی طرح
ہر خدا، ناخدا پہ چل جاؤں

حاصلِ غم

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

روز و شب کا وہ کاروانِ خموش
اپنے سینے کی آگ میں سوزاں
زیرِ مژگاں دہکتے انگارے
روح، ایک ایک رگ میں شعلہ فشاں
دل میں یادوں کے ٹوٹتے ہوئے خار
ضبط ۔۔۔ بے اختیار نعرہ زناں
اشک ۔۔۔ خاموش آتشِ سیال
فکر، فردا و دوش میں پیچاں
دور و نزدیک اجاڑ تنہائی
دوش پر بے بسی کا بارِ گراں

سوچتا تھا کہ میری غربت نے
اپنا سب کچھ لٹا کے کیا پایا
ایک خوش حال زندگی کے لیے
جنگ کے کام آ کے کیا پایا

یہ مرا گاؤں ۔۔۔ میری خلد زمیں
قبر کی طرح چپ، اداس اداس
زندگی جیسے عرصہ سکرات
کوئی آہنگ دور دور نہ پاس
کوچے کوچے میں وحشتیں رقصاں
ذرے ذرے پہ ثبت، خوف و ہراس
دل کو چپ چاپ کھائے جاتا ہے
دم بہ دم قرب مرگ کا احساس
عمر کے ہر گزرتے لمحے پر
ٹوٹتی جا رہی ہے ایک اک آس

سوچتا تھا ۔ یہ سوچ سے حاصل
میرا کعبہ تھا، میری ہی چھاؤں
کس سے پوچھوں کہ کیوں تباہ ہوا
جنگ سے دور رہ کے یہ گاؤں

سارے بنگال کی زمیں تھی آج
موت اور زندگی کی بازی گاہ
ایک میرا ہی گھر نہ تھا برباد
سارا بنگال ہو چکا تھا تباہ
ہر تقدس کی کوکھ تھی ناپاک
ہر تعلق کا اندروں تھا سیاہ
مائیں، بیٹوں کے پہلوؤں میں دفن
بہنیں تھیں بھائیوں کی عشرت گاہ
پارہ پارہ تھا شیشۂ عصمت
گودیوں میں ہمک رہے تھے گناہ

اسی قبروں کی زندہ بستی میں
دفن تھی میری کائنات تمام
اسی جنت کے نرم شعلوں میں
زندگی جل رہی تھی صبح و شام

دوسری زندگی

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ پسینے میں غرق شام و سحر
زندہ رہنے کے جرم کی پاداش
ہر نفس اک کراہ در آغوش
ہر قدم وقف جستجوئے معاش
روح میں تشنہ حسرتوں کی تڑپ
دل میں خار شکستگی کی خراش
کل تلک تھی جو زندگی کی روش
آج بھی کچھ وہی تھی اس کی تراش
کل بھی تھا روح پر یہ تن بھاری
آج بھی روح پر گراں تھی یہ لاش

سوچتا تھا کہ اس تباہی سے
جنگ بازوں کو کیا ملا آخر
کوئی محمود تو رہا محمود
ہم ایازوں کو کیا ملا آخر

زندگی کے ہر ایک گوشے میں
ایک اک چیز کاروباری تھی
کھیت کے کھیت تھے گھروں میں دفن
اور بھوکی خدائی ساری تھی
ہر تجوری میں قبر کی مانند
موت کی جوئے فیض جاری تھی
دیر تا کعبہ کوئی دوکاں ہو
ہر طرف زر کی شہریاری تھی
جنگ تو ختم ہو چکی تھی مگر
جنگ ایک ایک گھر میں جاری تھی

تنگ آ کر نہ جانے کتنی بار
دل نے سانسوں کا ساتھ چھوڑ دیا
لیکن اکثر مرے عزائم کو
ایک بچی نے ہنس کے توڑ دیا

میرا سب کچھ تو لٹ چکا تھا مگر
زندگی دے گئی تھی اک سوغات
ایک ذرہ کہ جس کے گردو پیش
گھومتے رہتے تھے مرے دن رات
سخت سے سخت ہو گئے آلام
تنگ سے تنگ تر رہے اوقات
ہر کٹھن راہ سے گزرتے رہے
میری واماندہ عمر کے لمحات
ایک کچی کلی سے ملتا رہا
اک خزاں دیدہ گلستاں کو ثبات

کیسے کیسے نہ خوں کے طوفاں میں
زندگی ڈوب کر ابھر آئی
ایک بچی کے واسطے یہ لاش
ہر کڑے دور سے گزر آئی

دوسری مسرت

آئینہ خانۂ تصور میں
ایک اِک نقش اُبھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی
آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

پھر وہی سانولی سلونی شام
وہی آباد شام تنہائی
وہی اک پرسکون ساعت غم
حاصل عمر ناشکیبائی
اک طرب زار، کرب آلودہ
اک الم کیش، بزم آرائی
ایک ویرانی، جس کے سامنے ہیچ
سیکڑوں جنتوں کی رعنائی
خواب حسن حیات کی تعبیر
اِک نئے دور کی پذیرائی

کتنے برسوں کے بعد آج آخر
وہی ساعت پلٹ کے آئی ہے
ایک واماندہ سفر کے لیے
ایک منزل کا خواب لائی ہے

میری بیٹی بنی ہے دلہن آج
یہ خوشی بھی عجیب ہوتی ہے
گل کھلاتی ہوئی ہر اک ساعت
دل میں اِک خار سا چبھوتی ہے
کانپ جاتا ہوں جب کوئی عورت
سوئی میں کوئی گل پروتی ہے
رشک جنت ہوا ہے گھر لیکن
زندگی منہ چھپا کے روتی ہے
مجھ کو شہنائیوں میں بھی محسوس
اک صدائے بِگل سی ہوتی ہے

آج پھر خدائے دولت ارض
نقش ہستی مٹائے جاتے ہیں
نت نئے کوریا --- نئے بنگال
سولیوں پہ چڑھائے جاتے ہیں

جنگ نے کتنے کھلتے غنچوں کو
پھول بننے سے پہلے توڑ دیا
کتنی راتوں کی مانگ سنولا دی
کتنی صبحوں کا خوں نچوڑ دیا
کتنے کڑیل جوان جسموں کو
سوکھی شاخوں کی طرح توڑ دیا
صبح فردا کے کتنے خوابوں کو
ظلمتوں میں بھٹکتا چھوڑ دیا
ارتقا کے لپکتے قدموں کا
رخ کسی اور سمت موڑ دیا

کوئی سوچے، عروس فطرت کیوں
شام سے تابہ صبح روتی ہے
ایک سورج کی موت میں مضمر
کتنی کرنوں کی موت ہوتی ہے

بدلتے زاویئے

(ایک تمثیلی غنائیہ)

(غیر مطبوعہ)

آواز   کورَس   گیت

پرانا آدمی

نیا آدمی

(ایسی موسیقی جس سے وقت کے گزرنے کا احساس ہو)

آواز:

زندگی ۔۔۔ایک سفر
وقت ۔۔۔اِک راہگزر
آدمی ۔۔۔بت کدۂ دہر کا رنگیں پیکر
اپنے آزر کا تراشا ہوا اک نقش ۔۔۔مگر
خودنگر ۔۔۔خودشکن وخودگر
جس کی تقدیر سفر اور سفر

(ساز چھڑ جاتے ہیں، مختلف آوازوں میں ایک نغمہ ابھر آتا ہے)

کورس

جہانِ کن کے راز داں ہیں کون ۔۔۔ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون ۔۔۔ ہم
نقیبِ زندگی ہیں ہم
رفیقِ روشنی ہیں ہم

حریف تیرگی ہیں ہم
نوید صبح کی ہیں ہم
نئے جہاں کے پاسباں ہیں کون ۔۔۔ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون۔۔۔ ہم
جہانِ کن کے راز داں ہیں کون۔۔۔ہم
(نغمے کی آوازیں پس منظر میں چلی جاتی ہیں)

آواز:

اور یہ پابندِ سفر
غمِ ہستی کا شکار
اپنے اطراف سے محوِ پیکار
منزلِ زیست کی جانب نگراں
افتاں خیزاں
آفرینش سے بہ ایں عزمِ جواں
وقت کی راہگزر پر ہے رواں
(نغمے کی آوازیں دوبارہ ابھر آتی ہیں)

کورس

جہانِ کن کے راز داں ہیں کون ۔۔۔ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون ۔۔۔ ہم
یہ مہر و ماہ و کہکشاں
ہماری گردِ کارواں
ہمارا پرچم بلند
زمیں سے تا بہ آسماں
چہار سمت حکمراں ہیں کون۔۔۔ ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون ۔۔۔ہم
جہانِ کن کے راز داں ہیں کون۔۔۔ہم
(نغمے کی آوازیں آہستہ آہستہ ڈوب جاتی ہیں اور کسی ایک ساز پر ایسا تاثر ابھرتا آتا ہے جس سے تھکن اور مایوسی کا احساس ہو)

آواز:

رہ نوردی میں مگر پاؤں بھی تھک جاتے ہیں
راستے گردِ سرِ رہ سے بھی ڈھک جاتے ہیں
تیرہ و تار فضا ہو تو کبھی دل کا تیقن بھی کھٹک جاتا ہے
راہ پر چلتا مسافر بھی کبھی راہ بھٹک جاتا ہے

(غمگیں سروں میں ایک گیت شروع ہوتا ہے)

گیت

دنیا سے کیا پریت۔۔۔دوانے
دنیا سے کیا پریت
ہنسنا بھی ہے موت یہاں پر، پوچھ کلی کے من سے
اجیارے کی چاہ میں شمعیں جل جاتی ہیں تن سے
جھوٹے پریت کے سب افسانے
جھوٹے پریم کے گیت
دنیا سے کیا پریت۔۔۔دوانے
دنیا سے کیا پریت

چاند اور سورج ساتھی ہو کر ساتھ نہیں ہیں دونوں
ایک ہی دیس کے باسی ہو کر ساتھ نہیں ہیں دونوں
اپنے بھی ہیں یاں بیگانے
کوئی نہیں ہے میت
دنیا سے کیا پریت۔۔۔دوانے
دنیا سے کیا پریت

(گیت کی آواز آہستہ آہستہ ڈوب جاتی ہے اور سازوں پر مدہم سروں میں
دھیرے دھیرے ایسا تاثر ابھرتا ہے جس میں امید کا احساس نمایاں ہو)

آواز:

ایسے عالم میں کسی شمع کی مانوس جھلک
کسی بجلی کی چمک
دل میں جاگ اٹھتی ہے اک عزم کی مشعل لے کر
اور مسافر بہ صد آلامِ سفر
باندھ کر جسم پہ احرامِ دگر
وقت کی راہ پہ چل پڑتا ہے
زیست کی سمت نکل پڑتا ہے

(یکایک سازوں کا امید افزا تاثر کورس کی آوازوں میں بدل جاتا ہے)

کورس

دو چار قدم بس اور کہ ساتھی منزل دور نہیں
دو چار قدم
یہ راہ گزارِ ہستی ہے، پرخار سہی
ہم راہ نوردوں کے حق میں تلوار سہی
اس راہ کے ہر ہر گام پہ سو آزار سہی

لہراؤ علم
دوچار قدم
دوچار قدم بس اور کہ ساتھی منزل دور نہیں
دوچار قدم

چلنا ہے مقدر ہم سب کا، ہاں چلتے رہو
جلنے میں ہے جیون جوت نہاں بس جلتے رہو
سورج کی طرح ہر روز ابھرتے ڈھلتے رہو
سب ہو کے بہم
دوچار قدم
دوچار قدم بس اور کہ ساتھی منزل دور نہیں
دوچار قدم

(کورس کی آوازیں پس منظر میں چلی جاتی ہیں اور سازوں پر ایک اضطراری کیفیت جاری رہتی ہے)

پرانا آدمی:

کیسی آوازیں مرے کانوں سے ٹکراتی ہیں
کیسا نغمہ یہ فضاؤں میں ابھر آیا ہے

یک بہ یک توڑ دیا کس نے خموشی کا طلسم
کون غم خانۂ تاریک میں در آیا ہے
دل کی دھڑکن ہے کہ ہر لمحہ ہوئی جاتی ہے تیز
کوئی افسوں ہے کہ رگ رگ میں اتر آیا ہے
اک جہنم سا دہک اٹھا ہے سینے میں کہیں
سیل آتش ہے کہ دل تا بہ جگر آیا ہے
خوں میں حل ہو گئے بجلی کے شرارے جیسے
دوڑتے جاتے ہیں طوفان کے دھارے جیسے

(سازوں کی اضطراری کیفیت ختم ہو جاتی ہے اور کچھ لمحوں کے لیے سناٹا چھا جاتا ہے)

پرانا آدمی:

کچھ نہیں ، وہم ، فقط وہم کی شوریدہ سری
غالباً خوابِ پریشاں تھا کوئی۔۔۔ ٹوٹ گیا
ذہن میں شعلہ بکف تھا کوئی آوارہ خیال
جس کے ہاتھوں سے سرِ دامن دل چھوٹ گیا
دل کی بستی پہ کسی درد نے شب خوں مارا
اور شاید وہی بیدرد اسے لوٹ گیا

کتنی ویران فضا ہے، کوئی نزدیک نہ دور
ایک گھمبیر اندھیرے میں ہے دنیا محصور

(جماہی لیتا ہے)

خیر۔۔یوں بھی کبھی ہوتا ہے۔۔خیالو۔آؤ
نیند کی گود میں سر رکھ کے ذرا سو جاؤ

(سازوں کی خواب گوں کیفیت یکا یک رجزیہ کورس میں بدل جاتی ہے)

کورس

بیدار رہو
ائے دنیا کے رکھوالو
ہشیار رہو

تاروں کے اشارے کہتے ہیں
بجلی کے شرارے کہتے ہیں
ساحل کی موجیں چیختی ہیں
طوفان کے دھارے کہتے ہیں
آنکھوں میں جنھوں نے شب کاٹی
وہ چاند ستارے کہتے ہیں

صدیوں سے ہیں جو دل مہر بہ لب
وہ ظلم کے مارے کہتے ہیں

بیدار رہو
ائے دنیا کے رکھوالو
ہشیار رہو

اس دنیا کے معمار ہو تم
ہستی کے علم بردار ہو تم
تخریب پرستوں کے حق میں
اک سونتی ہوئی تلوار ہو تم
باطل کے مقابل جو گونجے
سچائی کی وہ للکار ہو تم
ہیں کوہ بھی جن کے آگے نگوں
وہ سر بہ فلک دیوار ہو تم

بیدار رہو

اے دنیا کے رکھوالو

ہشیار رہو

(کورس کی آواز پس منظر میں چلی جاتی ہے)

پرانا آدمی: (جھلاہٹ کے لہجے میں)

پھر وہی شور، وہی نالہ شب جاگ اٹھا
پھر اُسی نغمہ جاں سوز کے شعلے لپکے
پھر وہی آگ بھڑک اٹھی جو شب بھر بھڑکی
ایک لمحہ بھی تو بیتا نہ تھا پلکیں جھپکے

(قدموں کی آواز)

نیا آدمی: (مسکراتے ہوئے)

تم کو ان گیتوں پہ شعلوں کا گماں ہوتا ہے
تم کو یہ نغمۂ بے باک بہت کھلتا ہے
یہ ہے اس دور کا وہ زخم جگر سوز کہ جو
سینۂ وقت میں مدت سے یونہی پلتا ہے
آج وہ زخم جگر پھوٹ بہا ہے اے دوست
اک شرر، شعلۂ جوالہ ہوا ہے اے دوست

یہی شعلہ ہے چراغ تہہ دامان حیات
اسی شعلے سے منور ہیں تمہارے دن رات

پرانا آدمی: (نظرانداز کرتے ہوئے) ہونہہ

وقت تو ایک بگولا ہے کہ اڑتا ہی چلا جاتا ہے
زندگانی میں کوئی لمحہ شاداب نہیں
روح حیران ہے، آنکھوں کے جزیرے ویراں
دل کے صحرا میں کہیں چشمۂ مہتاب نہیں
دور تک ایک سلگتا ہوا سناٹا ہے
کٹ گئی شب مگر آنکھوں میں کوئی خواب نہیں
اور اب صبح بھی آئی ہے تو کیا آئی ہے
ساغر گل میں بھی شبنم کی مئے ناب نہیں
ایسے عالم میں بھلا کوئی جیئے تو کیسے
جان کر جرعہ زہر اب پیئے تو کیسے

نیا آدمی: (سمجھاتے ہوئے)

زندگی جرعۂ زہر اب نہیں جانِ عزیز
بات کچھ اور ہے جس کی نہیں تم کو تمیز
سالہا سال سے انسان ہے جس غم کا اسیر

اس کو انساں ہی نے پالا ہے بنام تقدیر
آدمی جس بت سفاک کا ہے سجدہ گزار
اس کا خالق بھی ہے انساں ہی کا ذہن بیدار
خیروشر۔۔۔خاک کے پیکر کی ہیں اقدار نہاں
اہرمن بھی ہے وہی اور وہی ہے یزداں
یہ دوئی۔۔۔ایک اکائی کی ہیں تصویر کے رخ
کہیں تخریب کے رخ ہیں کہیں تعمیر کے رخ
آدمی ہی نے سدا اپنے لیے دام بنے
اس چمن زار سے کچھ پھول تو کچھ خار چنے
خاروگل ایک ہی موسم کی ہے سوغات مگر
ان کو بانٹا گیا دنیا میں بہ عنوان دگر
یہی اک راز ہے جو پردۂ افلاک میں ہے
جس کی پرکاری فن، فطرتِ چالاک میں ہے
یہ صدی کھول رہی ہے انہیں اسرار کا بھید
دستِ اوہام کے ڈھالے ہوئے افکار کا بھید
جب بھی اس جال سے انسان نکل جائے گا
اپنی دنیا کا یہ ماحول بدل جائے گا

پرانا آدمی: (بات کاٹتے ہوئے)

محض دھوکہ ہے، یہ دنیا نہیں بدلے گی کبھی
اس شب تار کی قسمت میں کوئی صبح نہیں
صبح آئے بھی تو ہوگی وہ کسی شب کا فریب
گردش وقت سے بھی زیست بدلتی ہے کہیں
مجھ کو معلوم ہے، دنیا کی حقیقت کیا ہے
محض اعجازِ نظر ہے یہ مہ و مہر و زمیں
ہم سب آئینہ در آئینہ ہیں اک عکس خیال
زندگی اس کے سوا کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں

نیا آدمی:

کتنے ناداں ہو، مگر جو ہے، وہ ہے توائے دوست
'ہے' کو ہم کیسے 'نہیں' کہہ کے گزر سکتے ہیں
عکس وآئینہ کے جس ربط کا حاصل ہے حیات
اس تعلق کو زمیں کہہ کے گزر سکتے ہیں

جس عقیدے سے عبارت رہا انساں کا وجود
اس عقیدے کا جگر چاک بھی کرنا ہو گا

آگہی نے جو چراغاں سا کئے رکھا ہے
اس سے 'امکان' کا ادراک بھی کرنا ہو گا

وہی امکان جو ہر عہد کے باطن کا ہے عکس
غیر ممکن میں ہمیشہ سے جو ممکن کا ہے عکس
اسی ممکن سے عبارت ہے سفر کی تاریخ
فکر، احساس، خبر اور نظر کی تاریخ

اسی تاریخ میں پوشیدہ ہے انساں کا خمیر
صرف انسان سے ہے ارض و سما کی توقیر
یہ زمیں روزِ ازل کیا تھی بجز تودۂ خاک
کس نے اس خاک کے تودے کی جگائی تقدیر
ذرۂ خاک میں انساں نے کی وسعت کی تلاش
ورنہ آفاق تھے خود اپنی نگاہوں میں حقیر
یہ مہ و مہر، یہ افلاک، یہ دنیا وہ جہاں
ان کے اسرار کی دریافت ہے کس کی تسخیر

کس کے افکار و عمل کی ہے یہ دنیا غماز
کس کے خوابوں سے ہوئی دونوں جہاں کی تعمیر
لوحِ محفوظ سے کاغذ کے ان اوراق تلک
ذہن سے تا بہ قلم کس کا ہے نقش تحریر
کس نے خاموش تصاویر کو حرکت بخشی
گنگ ہونٹوں کو دیا کس نے یہ ازن تقریر
کس نے رفتار کو یہ برق روی سکھلائی
کس کے زیر کفِ پا، وقت ہوا ہے زنجیر
آج کتنے ہی تصور ہیں حقیقت بہ کنار
آج کتنے ہی تخیل ہیں یقیں کی تصویر
کتنے اوہام کا مامن تھا جہانِ گزراں
کتنے افسوں کے حصاروں میں تھا ہر عہد اسیر
کس نے پتھر سے تراشا ہے وہ آئینہ فکر
جس میں ہر خواب نے دیکھی ہے خود اپنی تعبیر
کائنات ایک پراسرار حقیقت ہے ضرور
اس پراسرار حقیقت کا ہے انساں ہی سفیر

تم بھی انسان ہو، دیکھو کہ یہ دنیا کیا ہے
زندگی کیا ہے، خدائی کا تماشا کیا ہے

(نیا آدمی، پرانے آدمی کو کائنات کی سیر کراتا ہے۔صوتی اثرات سے یہ مناظر نمایاں ہوں اور انہیں کے امتزاج سے آرکسٹرا ہم آہنگ ہو کر یہ نغمہ چھیڑ دے جو مختلف اکاروں سے مزین ہو)

نغمہ

ہر ایک ذرہ اپنی حد میں ایک کائنات ہے
زمیں سے تا بہ آسماں حیات ہی حیات ہے
گلوں میں گلستاں نہاں
زمیں میں آسماں نہاں
جہاں میں دو جہاں نہاں
فنا میں بھی حیات ہے، ثبات ہی ثبات ہے
ہر ایک ذرہ اپنی حد میں ایک کائنات ہے
یہ صبح اور شام کیا
خرام اور قیام کیا
یہ فکر گام گام کیا

یہ وسعتیں یہ فاصلے، بس اک قدم کی بات ہے
ہر ایک ذرہ اپنی حد میں ایک کائنات ہے
چراغِ زندگی ہیں ہم
ایاغِ سرخوشی ہیں ہم
سراغِ روشنی ہیں ہم
ہمارے دم قدم سے اس جہان کو ثبات ہے
ہر ایک ذرہ اپنی حد میں ایک کائنات ہے
چلو بہ عزم مستقل
قدم قدم ہو متصل
کہ مہر و ماہ ہوں خجل
چلو کہ اپنے زیر پا، تمام شش جہات ہے
ہر ایک ذرہ اپنی حد میں ایک کائنات ہے

(نغمہ اپنی اکاروں کے ساتھ پس منظر میں چلا جاتا ہے اور سازوں پر ایک فکر انگیز غنائی تاثر نمایاں ہونے لگتا ہے جس کے سر ابتدائی کورس سے ہم آہنگ ہوتے ہیں)

پرانا آدمی:

آدمی اتنا ہمہ گیر ہے! معلوم نہ تھا
اپنے ہی خواب کی تعبیر ہے! معلوم نہ تھا

اور مری فکر کے بے جان ہیولوں میں فقط
میرا خاکہ، میری تصویر ہے! معلوم نہ تھا
میں جسے نقطۂ موہوم سمجھ بیٹھا تھا
وہ مرا نقطۂ تعمیر ہے! معلوم نہ تھا
میری پیشانی پہ لکھا ہے جو اک حرف غلط
خود مرے ہاتھ کی تحریر ہے! معلوم نہ تھا
اپنی دانست میں جس دام سے آزاد تھا میں
وہی اس پاؤں کی زنجیر ہے! معلوم نہ تھا
میری نظروں سے نہاں تھی جو حقیقت اب تک
اس حقیقت کی یہ تنویر ہے! معلوم نہ تھا
موت بھی زیست کا اک روپ ہے! یہ نکتۂ راز
ذہن فطرت ہی کی تدبیر ہے! معلوم نہ تھا
میرے ہر ایک عمل، ردِ عمل میں پنہاں
میرے ادراک کی تطہیر ہے! معلوم نہ تھا
دستِ فطرت میں مری ذات کھلونا ہی سہی
میرے بس میں مری تقدیر ہے! معلوم نہ تھا

زندگی مجھ کو بھی آواز دے۔۔۔ میں آتا ہوں
مجھ کو بھی اذنِ تگ وتاز دے۔۔۔میں آتا ہوں

(ابتدائی کورس ابھر آتا ہے)

کورس

جہانِ کن کے راز داں ہیں کون۔۔۔ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون۔۔۔ ہم
نقیبِ زندگی ہیں ہم
رفیق روشنی ہیں ہم
حریف تیرگی ہیں ہم
نوید صبح کی ہیں ہم
نئے جہاں کے پاسباں ہیں کون۔۔۔ہم
قدم قدم پہ کامراں ہیں کون۔۔۔ ہم
جہانِ کن کے راز داں ہیں کون۔۔۔ہم

(پس منظر میں کورس کا آرکسٹرا بجتا رہتا ہے)

آواز:

زندگی۔۔۔ایک سفر
وقت۔۔۔اک راہگزر

آدمی ۔۔۔ بت کدۂ دہر کا رنگیں پیکر
اپنے آزر کا تراشا ہوا اک نقش ۔۔۔ مگر
خودنگر ۔۔۔ خودشکن وخودگر
جس کی تقدیر سفر اور سفر

(کورس کی آواز ابھر کر کچھ لمحے نمایاں رہتی ہے پھر دھیرے دھیرے دور ہوجاتی ہے
گویا سفر جاری ہے)

شکست کی آواز

(ایک کرداری منظوم تمثیل)

(مطبوعہ 'فنون' لاہور۔۱۹۶۵ء)

پروفیسر
آواز
اور
کچھ صوتی اثرات

(مختلف لوگوں کی آوازیں۔طنزیہ فقرے اور قہقہے جو پروفیسر کے ذہنی انتشار کی علامت ہیں آخر پروفیسر چیخ پڑتا ہے)

پروفیسر: چپ رہو۔۔۔
جاؤ، مجھے اور پریشاں نہ کرو
اپنے الفاظ کو میرے لیے ارزاں نہ کرو
میں اسی غم کا سزاوار تھا
جو کچھ بھی ہوا۔۔۔ٹھیک ہوا
میں پشیمان ہوں، نادم ہوں
مجھے اور پریشاں نہ کرو

(آوازیں آہستہ آہستہ ابھر کر پس منظر میں چلی جاتی ہیں، پروفیسر زور سے دروازہ بند کر دیتا ہے گویا اس نے اپنے ذہن کا دنیا کی طرف کھلنے والا دروازہ بند کر دیا ہو۔کچھ لمحے مکمل خاموشی)

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دنیا کیا ہے
آگہی بھی ہے بری چیز تو اچھا کیا ہے

(گہری سانس لیتا ہے۔قدرے توقف کے بعد اونچی آواز میں)

اے خدا، اے مرے معبود
کوئی راہ فراغ
جس قدر سوچتا جاتا ہوں
الجھتا ہے دماغ
بجھتا جاتا ہے ہر اک منزل عرفاں کا چراغ
(ادھر ادھر دیکھتے ہوئے)
دور تک قبر کے مانند۔۔۔اندھیرا ہے محیط
دفن ہو جائے نہ اس میں مرے افکار کی دنیائے بسیط
(زیرِ لب)
میں نے چاہا تھا۔۔۔
مرے دل میں تھے کیا کیا ارماں
کیسے کیسے نہ خیالات کا محور تھا دماغ
کتنے سورج تھے مرے ذہن کے نادیدہ افق پر تاباں
کتنے مہتاب فروزاں تھے مری روح کی پہنائی میں
کتنے انجم کی ضیا تھی مری تنہائی میں
کتنی شمعیں تھیں فروزاں۔۔۔
کہ مرے کلبۂ ویراں میں چراغاں کا گماں ہوتا تھا

(اپنے آپ سے)
میں نے دیکھا تھا کہ یہ دہر ہے اک شیش محل
اور اس شیش محل میں ہے ہر اک شے بیکل
آدمی اپنے ہی پرتو سے ہراساں ہے یہاں
زندگی آپ بنی جاتی ہے، اپنا مقتل
میں نے سوچا تھا کہ اس وہم کا افسوں ٹوٹے
دستِ اوہام سے ایقان کا دامن چھوٹے
افقِ ذہن سے ابھرے کوئی صبحِ ادراک
اور اس صبح سے اک نور کا چشمہ پھوٹے
میں نے چاہا تھا کہ اس نور سے دنیا کے اندھیروں کا مداوا کردوں
وسعتِ دہر میں پھیلا کے اجالا ہر سمت
لمحے لمحے کو حریف دمِ عیسیٰ کردوں
لیکن اس چاہ کا، اس فکر و عمل کا انجام؟
(یکا یک ایک زہریلا قہقہہ گونج اٹھتا ہے)
آواز: آج معلوم ہوا اپنی حقیقت کیا ہے؟
دل کے بازار میں اک ذہن کی قیمت کیا ہے؟
پروفیسر: (چونک کر)

کون ہو تم؟

آواز: مجھے تم بھول گئے شاید
میں وہی کشتۂ افکارِ گراں مایہ ہوں

(غور سے دیکھتے ہوئے)

پروفیسر: میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے تم کو شاید

آواز: میں اسی پیکرِ ادراک کا ہمسایہ ہوں

(زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ)

ہم ہیں وہ دوست کہ ہر بعد کے باوصف ہمیں
ایک ہی نام سے دنیا نے پکارا برسوں
ہم ہیں وہ ثابت و سیار، خلاؤں میں جنہیں
وقت کی گردشِ پیہم نے سہارا برسوں
ہم ہیں اک شاخ کے دو پھول، وہ گلہائے دو رنگ
اپنے ہی ذوقِ تماشہ نے نکھارا ہے جنہیں
ہم ہیں اک بحر کی موجیں وہ سبک رو موجیں
عیشِ ساحل نے تلاطم پہ ابھارا ہے جنہیں

پروفیسر: (الجھ کر)
میں نہیں سمجھا کہ تم کون ہو؟

کیا کہتے ہو؟

آواز: تم تو اپنے ہی خیالوں میں نہاں رہتے ہو
اک نظر مجھ کو ذرا غور سے دیکھو تو سہی
کیا میں آئینہ تمہارا نہیں؟

(مانتے ہوئے)

پروفیسر: ہاں۔۔۔ ہو تو سہی

آواز: میں وہی ہوں، جسے تم مار چکے ہوائے دوست
آج یہ بازی بھی تم ہار چکے ہوائے دوست

پروفیسر: (حیرت سے)
کیا کہے جاتے ہو

آواز: جی۔۔۔ میں ہوں وہی خانہ خراب
مشتِ خوں جان کے

پروفیسر: (پہچان کر)
تم۔۔۔ تم ہو!

آواز: جناب
میں تمہارا دلِ مرحوم ہوں
اور زندہ ہوں

آج تک زیست سے محروم ہوں
اور زندہ ہوں
(تصور کرتے ہوئے)
میری آنکھوں میں ابھی تک ہے وہ دنیا بے خواب
جس کے آفاق پہ ابھرا نہیں کوئی مہتاب
میرے ہونٹوں پہ تڑپتی ہے ابھی تک وہی پیاس
جس کو ساغر کی کھنک تک کبھی آئی نہیں راس
میری رگ رگ میں وہی خون ہے اب تک رقصاں
جس کے ہر قطرے میں دوزخ کی تپش ہے پنہاں

پروفیسر: (حیرت سے)
تم ابھی زندہ ہو؟

آواز: جی ۔۔۔ اور اس طرح جواں
میری دنیا میں نہیں کوئی غم عمر رواں
مجھ میں آباد ہے اب تک وہ جہانِ بے نام
جس کا ہر ذرہ ہے خود اپنی جگہ حسن تمام
جس کا ہر رنگ اچھوتا ہے، دھنک کے مانند
جس کا ہر روپ انوکھا ہے، فلک کے مانند

جس کی خوشبو نہیں منت کشِ دامانِ صبا
جس کے پھولوں نے اٹھایا نہیں احسانِ صبا
جس میں تم نے بھی گزارے ہیں مہ و سال کئی
جس میں روشن ہیں ابھی تک وہ خدوخال کئی
جن کی ہم دونوں نے اک عمر پرستش کی ہے
جن کو اپنانے کی ہم دونوں نے خواہش کی ہے

پروفیسر: میں نے؟

آواز: ہاں تم نے

پروفیسر: مجھے یاد نہیں

آواز: یاد کرو
وہ حسیں ماہ جبیں

پروفیسر: ماہ جبیں

آواز: یاد کرو
وہ ۔۔۔ جسے تم نے تصور میں بسا رکھا تھا
خواب کی طرح نگاہوں میں چھپا رکھا تھا
غنچۂ دل میں تھی سوئی ہوئی خوشبو کی طرح
دشتِ تخیّل میں جولاں، رم آہو کی طرح

جب بھی وہ سامنے آتی تو نظر جھک جاتی
موجِ انفاس بھی چلتے ہوئے رک رک جاتی
پَرتَوِ حسن سے ہر سمت اُجالا ہوتا
کاش اس لمحہ کوئی دیکھنے والا ہوتا

(پروفیسر کو کھویا ہوا پا کر)

یاد ہے تم کو وہ اک دھند میں کھوئی ہوئی رات
وہی گہوارۂ مہتاب میں سوئی ہوئی رات
جاگتی آنکھوں سے ہم دیکھ رہے تھے اک خواب
ذہن اور دل پہ تھا چھایا ہوا کیفِ مئے ناب
صحن گل میں تھی وہ شہزادیِ نکہت رقصاں
لمسِ آہنگ سے تارِ رگِ جاں تھے لرزاں
نم فضاؤں میں سلگتے ہوئے جذبات کی تان
نغمگی کے پسِ پردہ وہ دلوں کے پیمان

پروفیسر: (اضطراب کے عالم میں)
میرا ماضی نہ مجھے یاد دلاؤ ۔۔۔ جاؤ
یہ بجھی آگ خدارا نہ جلاؤ ۔۔۔ جاؤ

پروفیسر: یہ بجھی آگ ہے۔۔۔خوب!

آگ بجھی بھی ہے کہیں؟
آگ بجھ جائے تو زندہ بھی رہے گی یہ زمیں؟
یہ مہ و مہر ہیں کیا چیز اگر آگ نہیں
زندگی کے ہر اک ایوان میں پوشیدہ ہے آگ
زندگی کے ہر اک امکان میں پوشیدہ ہے آگ

پروفیسر: وہ خطائے دلِ ناداں تھی۔۔۔گناہِ معصوم

آواز: (بات کاٹتے ہوئے)
شکر ہے، تم نے کہا تو اسے معصوم گنہ
میرا ہر ایک عمل
کوئی نہ مانے لیکن
پاک و معصوم ہوا کرتا ہے
کاش تم نے مجھے سمجھا ہوتا

(چڑ کر)

پروفیسر: میں تمہیں خوب سمجھتا ہوں
تم انسان کا وہ روپ ہو جو قیدِ تعین میں نہیں آ سکتا
جو خط و خال کا پابند نہیں
آج اس روپ میں عریاں ہو

تو کل روپ نیا دھار کے آ جاؤ گے

آواز: (زور کا قہقہہ لگاتا ہے)

کتنے نادان ہو تم

وقت نے کچھ نہ سکھایا تم کو

میں تو سمجھا تھا کہ یہ منزلِ عمرِ گزراں

تھک کے بیٹھے ہو جہاں

کر چکی ہو گی ہر اک رازِ نہاں، تم پہ عیاں

آج معلوم ہوا

زیست بیکار سفر ہے۔۔۔جس میں

کوئی منزل ہے نہ منزل کا نشاں

(ٹھنڈی سانس لے کر)

کاش تم میری رفاقت میں بھی کچھ عمر بسر کر لیتے

میرے ہمراہ بھی دو گام سفر کر لیتے

(اسی لہجے میں)

پروفیسر: وہ حسیں لمحۂ رفتہ

جو تمہاری ہی رفاقت میں ملا تھا مجھ کو

جو مری عمر کی پیشانی پہ اک داغ سیہ بن کے دمکتا ہے ابھی

آواز: داغِ سیہ!

تم اُسے داغِ سیہ کہتے ہو

وہ حسیں لمحہ جو چھو کر بھی نہ گزرا تم کو

وہ جو آیا تھا کسی سایہ ابرِ گزراں کے مانند

وہ جو اِک خواب کے مانند نگاہوں میں رہا۔۔۔کھو بھی گیا

وہ جسے ایک نظر تم نہ کبھی دیکھ سکے

جس کو پانے کی تمنا بھی کی۔۔۔اور پا نہ سکے

تم اُسے داغِ سیہ کہتے ہو؟

اپنی ناکامی کا کیا خوب مداوا ہے

پروفیسر: (بات کاٹتے ہوئے)

غلط

میرے کردار کی توہین ہے یہ

وہ میری راہ میں آیا تھا تمہاری شہہ پر

تم نے چاہا تھا کہ میں اس کی خنک چھاؤں میں

اس کے آغوش میں چپ چاپ پگھل کر رہ جاؤں

اور کچھ دن غمِ دوراں سے کنارا کر لوں

آواز: (لہجہ بدل کر)

اور تم نے غمِ دوراں سے کنارا بھی کیا

پروفیسر: صرف تمہاری خاطر

آواز: خیر۔۔۔یوں ہی سہی

میں تم سے جدا بھی تو نہیں

میں تو نزدیک رگِ جاں ہوں

لہو بن کے رواں ہوں تم میں

تم ہو'میں'۔۔۔

اور مری ذات سے منسوب ہو تم

ہم ازل سے ہیں بہم

ظاہر و باطن کی طرح

کاش ان ظاہر و باطن میں کوئی خطِ تفاوت ہی نہ کھنچا جاتا

کوئی دیوار نہ حائل ہوتی

(اسی لہجے میں)

پروفیسر: میں نے بالقصد یہ دیوار اٹھائی ہے

کہ تم حد سے تجاوز نہ کرو

تم ہو جس رہ پہ رواں، وہ مری منزل ہی نہیں

تم میں اور مجھ میں بڑا فرق ہے

تم شب ہو میں دن

تم اندھیروں میں اجالوں کے تمنائی ہو

ایسے موہوم اجالوں کے جنھیں رات جنم دیتی ہے

آواز: (کھوئے ہوئے انداز میں)

رات۔۔۔خاموش۔۔۔حسیں

کیف و مسرت کی امیں

ایک دلہن کی طرح حجلۂ زرپوش میں بیٹھی

کسی آہٹ کا بڑے پیار سے رستہ تکتی

جیسے اب کوئی قریب آئے گا

اور آہستہ سے گھونگھٹ کو الٹ کر۔۔۔اس کو

زندگانی کے حسیں راز بتا جائے گا

پروفیسر: تم خدا جانے کہاں جا پہنچے

میرے نزدیک یہ سب خواب کی باتیں ہیں کہ جو

خود فریبی کے سوا کچھ بھی نہیں

تم جسے حسن سمجھتے ہو، وہ اندازِ نظر ہے اپنا

تم جسے عشق سمجھتے ہو، وہ ہے حسنِ ہوس

محض تسکیں کا بہانہ ہے

حقیقت میں فسانہ ہے تمہارا ہر خواب
میرے دن رات کا محور ہے ہمیشہ سے کتاب
کہیں خورشید بھی کرتا ہے طوافِ مہتاب؟

آواز: دل کی دنیا نہیں پابند نظامِ شمسی
لیکن اس بات کو تم کیا سمجھو
تم نے دل کو کبھی سمجھا ہی نہیں
حسن کو آنکھ سے دیکھا ہی نہیں
آنکھ تو صرف بصارت سے عبارت ہے تمہارے نزدیک
اور جس آنکھ کو ہے حسن کا نظارہ نصیب
اس کو تم بند کیے بیٹھے ہو
تم کو معلوم نہیں لمسِ نظر کی لذت
تم نے پائی ہی نہیں سوزشِ غم کی راحت
تم تو بس ذہن کے آوارہ بگولوں کے تعاقب میں بھٹکتے رہے
کیا جانیے کس دشتِ فراموشی میں

پروفیسر: میں نے جس دشت تفکر کی سیاحت کی ہے
تم کبھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے
میں نے ہر ذرے کے سینے میں اتارا خود کو

اور دل بن کے دھڑکتا رہا
خوں بن کے ہر اک رگ کی مسافت طے کی
میں نے ہر موج ہوا کے ہمراہ
وسعتِ ارض کے چکر کاٹے
میں ہواؤں سے خلاؤں میں اڑا
اور مہر و مہہ و انجم کے پر اسرار فسانوں کو
حقیقت سے ہم آہنگ کیا
میں نے معلوم کیا
وقت، خدا، زیست، یہ دنیا، وہ جہاں

آواز: (ہنستے ہوئے)
اور جب آنکھ کھلی
حدِ نظر تک تھا دھواں
ایک تم اور یہ تنہائی ۔۔۔ یہ تاریک مکاں
(زور کا قہقہہ لگاتا ہے)

پروفیسر: (غصے میں)
اوہ ۔۔۔ تم ۔۔۔ چپ رہو، خاموش
(سمجھاتے ہوئے)

آواز: بگڑنے کی ضرورت کیا ہے؟
میں تو سمجھا تھا کہ تم خواب سناتے ہو
ہر اک خواب کی تعبیر غلط ہوتی ہے
اس لیے میں نے یہ تعبیر بتائی تم کو

پروفیسر: تم مری بات پہ ہنستے ہو
مرے غم کا اڑاتے ہو مذاق
(زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ)

آواز: آج تم کتنے حسین لگتے ہو
برہمی بھی ہے عجب شئے
یہ غضب ناک نگاہوں کے لپکتے شعلے
شکن آلود جبیں پر یہ پسینہ۔۔۔جیسے
خشک پتوں پہ دمکتے ہوئے شبنم کے گہر
یہ لرزتے ہوئے ہونٹوں کا تشنج
بخدا
آئینہ دیکھو تو اپنے پہ فدا ہو جاؤ

پروفیسر: (جھلا کر)
تم نہیں مانو گے، تم یوں نہیں مانو گے

آواز: نہیں۔۔۔مان گیا ہوں تم کو
آج پہچان گیا ہوں تم کو
واقعی تم کو رہِ راست پہ لانا ہے محال
تم ہو اب عمر کی اس منزل میں
جس جگہ کوئی کسی کو نہیں سمجھا سکتا
تم کہو تو میں چلا جاؤں
اتر جاؤں پھر اس قبر کی ویرانی میں
جس میں اک میں ہی نہیں
سینکڑوں تشنہ تمناؤں کی زندہ لاشیں
اپنی تقدیر کو روتی ہیں
نہ جیتی ہیں نہ مر سکتی ہیں
سالہا سال سے اک مرگ مسلسل میں گرفتار ہیں
شاید یہی برزخ ہے ہماری دنیا (جانے لگتا ہے)
(حقیقت کو سمجھتے ہوئے)

پروفیسر: ٹھہرو۔۔۔اک بات سنو
تم نہیں جانتے۔۔۔میں، آج ہوں کس غم کا شکار

آواز: مجھ کو معلوم ہے

پروفیسر: پھر بھی تمہیں احساس نہیں

ایسے عالم میں یہ طعنے۔۔۔یہ کچوکے

آواز: میں نے۔۔۔

خیر جانے دو

پروفیسر: نہیں۔۔۔اس سبب بتلاؤ

تم تو احساس کی شدت کی علامت ہو

تمہیں

میرا مطلب ہے کہ تم

اتنے ظالم تو نہیں ہو سکتے

آواز: میں تو خود ظلم کا مارا ہوں

ستم جھیلے ہیں کیا کیا میں نے

جب تلک تم میں، تمہارے رگ و پے میں تھی حرارت

تم نے

مجھ پر ہر جبر کیا

جب بھی میں نے کوئی خواہش کی

کوئی بات بھی کہنا چاہی

میرے ہونٹوں پہ وہیں مہر، خموشی کی لگا دی تم نے

مجھ میں جاگا کوئی ارماں

کوئی نازک سی تمنا کبھی بیدار ہوئی

تم نے محسوس کیا، جیسے وہ ناگن ہے کوئی

تم نہ مارو گے تو ڈس لے گی تمہیں

کیسے کیسے نہ ستم تم نے کیے

کیسے کیسے نہ ستم میں نے سہے

میں کوئی ظلم کسی پر کبھی کر سکتا ہوں

میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ مجھے مار کے تم

وہی پتھر ہوا بھی۔۔۔

(بات کاٹتے ہوئے)

پروفیسر: پھر وہی بات۔۔۔تمہیں چین نہیں آئے گا

آواز: چین کس طرح سے آ سکتا ہے

میرے سینے میں دہکتا ہے جو دوزخ

جب تک

اس کا ہر شعلہ کوئی برگ گل تر نہ بنے

میری آنکھوں میں ہیں آباد جو خوابوں کے خرابے

جب تک

ان کی ویران فضاؤں کا دھواں
کوئی خوشبو نہ بنے
ان کے آفاق پر اڑتی ہوئی گرد
چادرِ نور نہ بن جائے
مجھے کیسے سکوں آئے گا

(پروفیسر سوچتے ہوئے کہتا ہے)

پروفیسر: اور شاید یہ مرے بس میں نہیں

(پورے یقین کے ساتھ)

آواز: بس میں سب کچھ ہے تمہارے
مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو
مجھ کو معلوم ہے۔۔۔تم نے کیا کیا
خودفریبی کے حسیں جال بچھا رکھے ہیں

پروفیسر: خودفریبی کے حسیں جال۔۔۔!
یہ کیا کہتے ہو؟

آواز: ہاں۔۔۔یہ انسان کی فطرت ہے کہ اپنے اطراف
اپنے ہاتھوں سے کوئی دام حسیں بنتا ہے
اور پھر عمر تمام

ایک بے نام تگ و دو میں لگا رہتا ہے
خود اُلجھتا ہے، سلجھتا ہے
سلجھتا ہے، اُلجھتا ہے
اسی کوشش بیکار میں دن رات بسر کرتا ہے

پروفیسر: ٹھیک کہتے ہو۔۔۔مگر
وہ حسیں دام ضروری نہیں یکساں ہو
کوئی گیسوئے پرخم کے حسیں دام میں ہوتا ہے اسیر
اور کوئی دامِ خیالات میں
یہ اپنے مزاج، اپنی نظر
اور اجازت ہو تو اک بات کہوں

(ذرا ٹھہر کر)

یہ ہیں سب ظرف کی باتیں
لیکن

آواز: یہ بھی ہے ایک حقیقت کہ ہر اک ظرف کی حد ہوتی ہے
حد سے باہر وہی دنیا ہے، وہی تم، وہی میں
لاکھ ہم حد میں سمٹ آنے کی کوشش کرلیں
زندگی بھر کسی زنداں میں نہیں رہ سکتے

زندگی رنگ ہے، خوشبو ہے، کوئی نور کا دھارا ہے جسے
قید کرنا ہے محال
اس کو گر قیدِ تعین میں بھی لایا جائے
تو کسی وقت بھی وہ حد سے گزر سکتا ہے
ذات کے محبس تاریک سے ہو کر آزاد
وسعتِ قلب دو عالم میں بکھر سکتا ہے

پروفیسر: میرا مطلب بھی یہی تھا۔۔۔ لیکن

آواز: یہی 'لیکن' تو ہے وہ لفظ جو ہر گام پہ دیوار بنا دیتا ہے
کتنی دیواریں اسی طرح نہ کھینچی تم نے
اپنی کھینچی ہوئی دیواروں میں بیٹھے ہو کسی سایۂ مجبور کے مانند نہ
جانے کب سے؟
تم فقط ذات کے زنداں ہی میں محبوس نہیں
بلکہ اس ذات کے اطراف بھی زنداں ہیں
ہزاروں زنداں
جن سے تم کو کبھی چھٹکارا نہیں مل سکتا

پروفیسر: تم خدا جانے کہے جاتے ہو کیا کچھ۔۔۔ آخر
صاف الفاظ میں کہتے نہیں کیوں؟

صاف کہو

آواز: میری ہر بات بہت صاف ہے
تم خود نہ سمجھنا چاہو
تو الگ بات ہے

پروفیسر: میں کچھ بھی نہ سمجھا کہ یہ دیواروں کا مطلب کیا ہے
میرے اطراف تو اب کوئی بھی دیوار نہیں

(یکایک ایک نوجوان جوڑے کی ہنسی اور قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ جیسے وہ باہر سے گھر میں آئے ہوں۔ پروفیسر کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ کر)

آواز: تم پریشان سے کیوں ہو گئے۔۔۔ کیا بات ہے؟
یہ ہنستے ہوئے لوگ برے لگتے ہیں؟

پروفیسر: تم نہیں جانتے

(بات کاٹتے ہوئے)

آواز: میں دونوں کو پہچانتا ہوں
دونوں شاگرد اسی 'پیکرِ ادراک' کے ہیں
ایک ان میں وہی لڑکی ہے جسے تم نے بڑے چاؤ سے
بیٹی کی طرح پالا ہے
اُس کے ساتھ اُس کا کوئی 'دوست' بھی ہے

پروفیسر: (ترش لہجے میں)
تم کو معلوم ہے یہ دونوں۔۔۔؟
آواز: محبت میں گرفتار ہیں۔۔۔میں جانتا ہوں
پروفیسر: تم نہیں جانتے۔۔۔یہ حد سے بڑھے جاتے ہیں
(قہقہوں کی آوازیں بدستور جاری ہیں)
آواز: یعنی اُس قید سے آزادی کے طالب ہیں جسے
تم نے ان دونوں پہ عائد کی ہے
پروفیسر: یہ کوئی قید نہیں
وہ تو آزاد ہیں اور قید ہوا چاہتے ہیں
(بات کاٹتے ہوئے)
آواز: بس یہی فرق ہے ہم دونوں میں
تم جسے قید سمجھتے ہو وہ آزادی ہے میرے نزدیک
پروفیسر: ہاں اگر یہ نہ سمجھتے تو کسی ذات کو محبس
کسی قانون کو دیوار نہ کہتے تم بھی
خیر، میں تو اسی دیوار، اسی محبس کا ہوں پابند۔۔۔مجھے
ایسی آزادی کی خواہش نہیں جس پر کوئی تحدید نہ ہو
میں سمجھتا ہوں کہ آزادی ہے پابندی جذبات کا نام

کوئی قانون ضروری ہے جو دیوار کے مانند کھنچا ہو اطراف
اور ہم حد سے نہ بڑھنے پائیں
آواز: دل کی دنیا نہیں پابند رسوم و آئین
لاکھ دیواریں اٹھاؤ۔۔۔لیکن
دل وہ وحشی ہے جو ہر لمحہ نئے دشت و بیاباں مانگے
پروفیسر: زندگی دشت و بیاباں کی تمنائی نہیں
اب وہ شہروں میں سمٹ آئی ہے
شہر کے تنگ حصاروں میں جو وسعت ہے
جو پھیلاؤ ہے وہ دشت و بیاباں میں کہاں۔۔۔
خیر اس بحث سے حاصل کیا ہے
تم نے سمجھی ہے مری بات نہ سمجھو گے کبھی
میں اس آزادہ روی کا کبھی قائل تھا نہ قائل ہوں گا
میں ابھی دونوں کو سمجھاتا ہوں
آواز: تم نے پہلے بھی تو سمجھائی ہے یہ بات انہیں
کب وہ خاطر میں تمہیں لائے
کوئی حکم بھی مانا اب تک؟
اپنے الفاظ کو ضائع نہ کرو

چپ رہو
دیکھتے جاؤ کہ تم۔۔۔عرصہ گہہ زیست میں اب ایک تماشائی ہو
اور کچھ بھی نہیں

پروفیسر: تم تو بہکاتے ہو مجھ کو
یہ غلط بات ہے
میں صرف تماشائی نہیں رہ سکتا
میں نے اس لڑکی کو پالا
اسے تعلیم دلائی ہے کہ وہ

آواز: زندگی بھر تمہیں اپنا سمجھے
عمر بھر صرف تمہارے ہی اشارے پہ چلے

پروفیسر: وہ ابھی اتنی سمجھ دار نہیں ہے

آواز: تو سمجھ دار بھی ہو جائے گی
اور پھر اتنی بھی نادان نہیں ہے کہ بھلے اور برے میں
کوئی تمیز نہیں کر سکتی
یہ بھی ممکن ہے کہ تم جس کو برا کہتے ہو
وہی اچھا ہو۔۔۔بہت خوب ہو اس کے نزدیک
(لڑکی کی گنگناہٹ سنائی دیتی ہے)

پروفیسر: اس کی آواز سنی تم نے۔۔۔؟
(مسکراتے ہوئے)

آواز: بہت پیاری، سریلی سی ہے آواز
بہت خوب گلا پایا ہے
آؤ آج اس سے کوئی گیت سنیں

پروفیسر: گیت؟

آواز: ہاں گیت۔۔۔ذرا لطف اٹھائیں کچھ دیر
فکر و احساس کو نغموں کی سبک لے میں بہا دیں۔۔۔آؤ
(پروفیسر کو گومگو کے عالم میں دیکھ کر)
آؤ بے کار تکلف نہ کرو
(الجھن محسوس کرتے ہوئے)

پروفیسر: کیسی باتیں کیے جاتے ہو۔۔۔سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ تم
تم کو معلوم ہے وہ۔۔۔وہ مری بیٹی کے برابر ہے

آواز: تو ہو
تم نے جس جذبۂ بے نام کی تسکین کی خاطر، اس کو
اپنی شاگرد بنایا، اسے یہ نام دیا۔ گھر میں رکھا
اور دن رات اسے اپنے قریں رکھتے ہو

پروفیسر: مجھ کو ان لفظوں سے کچھ ۔۔۔۔

(تائید کرتے ہوئے)

آواز: کوئی غلط بات نہیں

یہ بھی انسان کی فطرت ہے

یہ تنہائی، یہ ویران خموشی کب تک

کچھ تو اس غم کا مداوا ہو جائے

کوئی بے نام سی تسکین سہی

تشنگی کچھ تو مٹے

زندگی بھر کی مسافت میں ذرا دیر تو آرام ملے

پروفیسر: (بگڑ کر)

کیا کہے جاتے ہو

تم ۔۔۔

سوچ کے ہر بات کہو

آواز: سوچ سے مجھ کو تعلق کیا ہے

میں تو جذبات کی، احساس کی تصویر بناتا ہوں

مٹا دیتا ہوں

اور یہ تصویر تمہاری ہے ۔۔۔ مگر

تم نہ پہچان سکو گے اس کو

یہ ہے اس روح کی تصویر

جو اس جسم میں آویزاں ہے

یہ ضعیف اور تھکا ہارا بدن

جس کی ہر ایک شکن میں ہے جوانی کی وہ کروٹ پنہاں

جس کو آسودگی خواب نہیں مل پائی

وہ جو برسوں سے ہے بیدار

کسی رات کے آغوش میں سو جانے کو

پروفیسر: چپ رہو

یہ مرے کردار، مرے علم کی توہین ہے

آواز: میں خوب سمجھتا ہوں

یہ دھوکہ ہے جو تم خود کو دیے بیٹھے ہو

زعم آگاہی بھی ہے ایک فریب

تم ہر اک گام پہ اک دام کی الجھن میں گرفتار ہو

اور اس سے رہائی کو تم اک موت سے تعبیر کیا کرتے ہو

تم میں پوشیدہ ہے اک خوف

جو اک ناگ کے مانند ہے پھن پھیلائے

تم سمجھتے ہو کہ جیسے ہی تم اس دام سے باہر آئے
روح کا ناگ تمہیں ڈس لے گا
اور برسوں کی ریاضت
یہ خیالات کے آوارہ بگولوں کا تعاقب
یہ سفر
راہ کی اڑتی ہوئی گرد میں کھو جائے گا

(پروفیسر کو سوچتا ہوا پا کر)

تم کو معلوم نہیں
زندگی صرف سفر ہی نہیں ۔۔۔ کچھ اور بھی ہے
فکر کی راہگزر ہی نہیں ۔۔۔ کچھ اور بھی ہے

(الجھ کر)

پروفیسر: آخر اس درس کا مقصد کیا ہے؟
آواز: زندگانی کا حسیں روپ بھی دیکھو پل بھر
افق ذہن کے اس پار ۔۔۔ جہاں
نیلگوں چرخ کی پہنائی میں
چاند کے پاس ستارہ ہے
جو چپکے چپکے

چاند کی نقرئی باہوں میں سمٹ آیا ہے
کاخِ گل کے کسی خاموش جھروکے سے کبھی جھانک کے دیکھا تم نے
کسی بہکی ہوئی خوشبو کا کوئی رقصِ لطیف
اور شبنم کے روپہلے گھنگرو
جب بج اٹھتے ہیں تو سورج کی سنہری کرنیں
کس لیے سجدے میں جھک جاتی ہیں ۔۔۔ کیا پاتی ہیں؟
صبح دم موجِ صبا کرتی ہے کس کے لب و عارض کا طواف؟
اس کی اٹھلاتی ہوئی چال میں کیوں ہوتی ہے دل خیز ترنگ؟
کس کی آنکھوں کا نشہ
کس کے بدن کی خوشبو
کس کی زلفوں کی مہک
اس کے دامن میں چھپی ہوتی ہے
اک ذرا سوچو کہ فطرت کا تقاضا کیا ہے
عشق کیا چیز ہے اور حسن کا منشا کیا ہے
پروفیسر: لیکن اس تذکرۂ حسن سے اب کیا حاصل
آواز: موجِ طوفاں سے عبارت ہے سکونِ حاصل
پروفیسر: لیکن اب تو کوئی طوفاں نہیں مجھ میں پنہاں

آواز: سطحِ ساکن سے تموج نظر آئے گا کہاں
مجھ کو دیکھو، اسی طوفان کی اک لہر ہوں میں
سینکڑوں تشنہ تمناؤں کا اک شہر ہوں میں
اس خرابے کی تمہیں سیر کراؤں ۔۔۔ آؤ
اپنے خوابوں کے کچھ اہرام دکھاؤں ۔۔۔ آؤ
پروفیسر: خواب تو ہوتے ہیں محرومیِ دل کا حاصل
ان کھلونوں سے بہل سکتا ہے

(بات کاٹتے ہوئے)

آواز: مجھ سا کوئی دل
ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ مگر
میں تمہارا دلِ مرحوم نہیں ہوں اے دوست
اب بھی میں زیست سے محروم نہیں ہوں اے دوست
یہ کتابیں کہ جنہیں علم کی تربت کہیے
یہ نوشتے کہ جنہیں کذب صداقت کہیے
یہ قلم جیسے کوئی شمعِ مزار تازہ

(ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے)

کاش ہوتا، مرے غم کا بھی تمہیں اندازہ

پروفیسر: لیکن اب تو میں بہت دور نکل آیا ہوں
آواز: اسی دوری نے کیا ہے تمہیں منزل سے قریب
میرے ہمراہ چلو
تم تھکے ہارے ہو، بوڑھے ہو۔۔۔ یہ مانا لیکن
تم جواں بھی ہو، مری طرح تنومند۔۔۔ جواں
عمر بڑھ جائے تو بوڑھا نہیں ہوتا انساں
جب تلک تشنگیِ جذبہ و احساس ہے باقی
اے دوست
آدمی بھی ہے جواں
ضعف، آسودگیِ حسرت و ارماں کا ہے نام
آؤ۔۔۔ آج اپنی تمناؤں کی تکمیل کریں
زندگانی کے ہر اک حکم کی تعمیل کریں
آؤ۔۔۔ اس منظرِ خاموش کا نظارہ کریں
جس کے ہر رنگ سے آوازِ جرس آتی ہے
پروفیسر: تم کہاں مجھ کو لیے جاتے ہو؟
اس کمرے میں!
وہ سوئی ہے جس میں!

آواز: ہاں۔۔۔آؤ

پروفیسر: میں نہیں جاؤں گا۔۔۔ہرگز نہیں جاؤں گا

آواز: (بات کاٹتے ہوئے)

مگر اس سے تمہارا کوئی رشتہ تو نہیں
میرا مطلب ہے، کوئی خون کا رشتہ بھی نہیں
اور تم نے اسے جو 'نام' دیا ہے
وہی دھوکہ ہے جو تم خود کو دیئے بیٹھے ہو

پروفیسر: نہیں یہ بات نہیں ہو سکتی
تم مجھے ایک گنہہ کے لیے اکساتے ہو

آواز: تم تو مفروضوں کی دنیا میں جیئے جاتے ہو
یہ گنہہ اور ثواب۔۔۔اور یہ نیکی یہ بدی
محض مفروضے ہیں
خود ساختہ دیواریں ہیں
جن کی بنیاد میں کچھ بھی نہیں
سچائی کی اک اینٹ نہیں
یہ اصول اور ضوابط
وہ گھروندے ہیں جو تہذیب کے معماروں نے

کچی مٹی سے بنائے ہیں۔۔۔کسی وقت بھی ڈھ سکتے ہیں

پروفیسر: ٹھیک ہے
میں۔۔۔مگر اس قسم کا اقدام نہیں کر سکتا

آواز: (لہجہ تلخ ہو جاتا ہے)

اس کا مطلب ہے کہ تم ایک نمائش کا کھلونا ہو
وہ بے جان کھلونا، جس میں
زندگی کا کوئی امکان نہیں
تم بظاہر جو نظر آتے ہو۔۔۔ایک جھوٹ
حسیں جھوٹ ہے۔۔۔اور کچھ بھی نہیں
تم وہ پتھر ہو جو انسان نہیں بن سکتا
میں سمجھتا تھا کہ تم میں اب تک
زندگانی کی حرارت ہو گی
تم مگر برف کا پیکر نکلے

(مجبور ہو کر)

پروفیسر: تم۔۔۔
سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں۔۔۔
کیسے سمجھاؤں

ذرا غور کرو
کچھ تو سوچو کہ وہ کیا سوچے گی
آواز: سوچ کا وقت نہیں
تم کو چلنا ہے
اسی سمت جدھر میں چاہوں
میں نے ہر جبر گوارا کیا اب تک لیکن
اب میں یہ جبر، نہ برداشت کروں گا
آؤ
تم نے کل تک تو مجھے قوتِ بازو سے
ارادوں کی اٹل طاقت سے
سرکشی سے مجھے روکے رکھا
اب مگر تم میں وہ طاقت نہیں
وہ عزم وارادہ کی صلابت نہیں
تم موم کا ایک بت ہو جواب میرے تصرف میں ہے
میرے بس میں
آؤ، اب وقت نہ برباد کرو
میرے ویرانے کو آباد کرو

پروفیسر: تم، مگر۔۔۔ اتنا تو سوچو کہ میں بوڑھا ہوں
بڑھاپے کا جوانی سے علاقہ کیا ہے
مجھ میں اور اس میں سن وسال کا ہے کتنا تفاوت۔۔۔ سوچو
آواز: یہ تفاوت ابھی مٹ جائے گا
جب بڑھاپے کو جوانی کا سہارا ہوگا
ہر بڑھاپے کو سہارے کی ضرورت ہے
سہارا کوئی بوڑھا تو نہیں دے سکتا
آؤ۔۔۔ چپ چاپ چلے آؤ۔۔۔ ادھر
(پروفیسر لڑکی کی خواب گاہ میں چلا جاتا ہے)
آواز: دیکھو۔۔۔ یہ خواب میں کھویا ہوا حسن
سرخ ہونٹوں پہ یہ ہلکا سا تبسم۔۔۔ توبہ
اور زلفوں کا یہ بکھرا ہوا انداز
یہ قامت کی درازی
یہ تراشا ہوا جسم
اور یہ ایک دریچے سے خنک چاند کی کرنوں کا نزول
جیسے اک چادرزرتار
فرشتوں نے اسے عرش سے بھیجی ہے

ذرا دیکھو تو

ایسی تنہائی میں تم نے کبھی دیکھا کوئی سویا ہوا حسن

ہاں ۔۔۔ ذرا جرأت رندانہ سے لو کام

ذرا ہاتھ بڑھاؤ ۔۔۔ یہ لرزتے ہوئے ہاتھ

ریشمی زلفوں کو چھو کر دیکھو

آج محسوس کرو لمس کی راحت اے دوست

زندگانی ہے اسی راحت محسوس کا نام

(یکایک پروفیسر پیچھے ہٹ جاتا ہے)

کیا ہوا ۔۔۔ ڈر گئے؟

کیا سوچ رہے ہو؟

مجھے اس طرح سے کیوں دیکھ رہے ہو؟

(پریشان ہو کر)

یہ نگاہوں میں ہیں شعلے کیسے؟

تم مجھے کھینچ کے لے جاتے ہو اس طرح کہاں؟

پروفیسر: (اپنے کمرے میں آتے ہوئے)

مجھ کو بہکائے لیے جاتا تھا

مجھ کو سمجھا تھا کہ بوڑھا ہوں میں، کمزور ہوں میں

تیری طاقت سے میں دب جاؤں گا

تو نے آخر مجھے سمجھا کیا ہے

(منیر کی دراز سے پستول نکالتا ہے)

میں تجھے آج فنا کر دوں گا

آج میں تجھ کو فنا کر دوں گا

(یکایک پستول کی آواز فضا میں گونج جاتی ہے اور ساتھ ہی پروفیسر کی دل دوز چیخ سنائی دیتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں دروازہ پیٹنے اور پھر ٹوٹنے کی آوازیں اور انہی میں لوگوں کا شور ۔۔۔

'پروفیسر نے خودکشی کر لی'

'پروفیسر نے خودکشی کر لی'

اسی شور میں ایک نسوانی چیخ بلند ہوتی ہے ۔۔۔ اور پھر مسلسل رونے اور چیخنے کی آوازیں دیر تک جاری رہتی ہیں)

فن تحقیق
اوج کمال

حمایت علی شاعر کی کتابیں

شاعری

1۔ آگ میں پھول (نظمیں، غزلیں، رباعیات)

2۔ مٹی کا قرض (ثلاثیاں، نظمیں، غزلیں)

3۔ تشنگی کا سفر (طویل افسانوی اور تمثیلی نظمیں اور غنایئے)

4۔ ہارون کی آواز (نظمیں، غزلیں اور ایک طویل نظم)

5۔ آئینہ در آئینہ (منظوم خودنوشت سوانح حیات)

6۔ حرف حرف روشنی (منتخب کلام)

7۔ عقیدت کا سفر (سات سو سال کی نعتیہ شاعری کا انتخاب)

8۔ تجھ کو معلوم نہیں (منتخب فلمی نغمات)

9۔ چاند کی دھوپ (تازہ کلام)

تراجم

بنگال سے کوریا تک (طویل افسانوی نظم)

1. *Flower in Flames* By Prof: Rajinder Singh Verma
(Panjabi University Patyala. India)
2. *Flute and Bugle* By Parkash Chander
(Editor. "Times of India" Delhi)

3۔ (ہندی) ترجمہ نگار: پروفیسر جی این نداف (مولانا آزاد کالج، اورنگ آباد)

4۔ (سندھی) گل باہ مہ۔ ترجمہ نگار: ایم ای عالمانی (حیدرآباد، سندھ)

حرف حرف روشنی (طویل نظم اور منتخب کلام)

1. *Every Word Aglow* By Prof: Rajinder Singh Verma

2۔ حرف حرف روشنی (ہندی) ترجمہ نگار: بھگ تل (مہاراشٹر) Mr. C.Gaius Bhatul

3۔ شبد شبد پرکاش (ہندی) ترجمہ نگار: قاضی رئیس (مہاراشٹر)

نثری کتب

1۔ شیخ ایاز (سندھی کے جدید عہد آفریں شاعر کا مطالعہ)

2۔ شخص و عکس (مقالات، تبصرے اور مباحث)

3۔ کھلتے کنول سے لوگ (حیدر آباد دکن کے اہلِ قلم)

4۔ حمایت علی شاعر کے ڈرامے (ریڈیو اور اسٹیج ڈرامے)

تراجم

1۔ حمایت علی شاعر جا ڈراما (رشید احمد لاشاری، ایم بی انصاری، ممتاز مرزا، محمد اسحاق پیرسرہندی)

اختلافی مباحث

1۔ کسی چمن میں رہو تم (مرتب، قاصد عزیز اور نعمت اللہ)

2۔ احوالِ واقعی (مرتب، پروفیسر مرزا سلیم بیگ)

3۔ بارشِ سنگ سے بارشِ گل تک (مرتب، رعنا اقبال)

4۔ تثلیث یا ثلاثی (مرتب، رعنا اقبال)

حمایت علی شاعر...فن و شخصیت (مقالہ برائے پی ایچ ڈی)

مقالہ نگار: رعنا اقبال (ڈپٹی ڈائریکٹر ریسرچ وانفارمیشن، وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی)

منتظرِ اشاعت

1۔ نقطۂ نظر (تحقیقی اور تجزیاتی مضامین)

2۔ مہران موج (سندھ کی عوامی کہانیوں کا تمثیلی روپ)

3۔ چنگاریاں (اردو شاعرات کا مطالعہ)

4۔ نئی پود (نئی نسل کے اہلِ قلم)